ISSN 0974-7346

فروری ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۲

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ رجب المرجب ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۲۳ء | عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

نئے عیسوی سال کو شروع ہوئے اب ایک مہینہ ہو رہا ہے، معارف کی نئی جلد بھی نئے سال کے آنے کی خبر دیتی ہے، جنوری کے شمارہ پر جلد نمبر دو سو دس کا عدد درج ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور احسانات کے لیے بندوں کو شکر گزاری کے کیسے کیسے بہانے عطا کرتے ہیں۔ معارف کی فائلوں کو دیکھیے تو معارف کے مدیر اول مولانا سید سلیمان ندوی اکثر نئی جلد کے آغاز پر معارف کی درازیٔ عمر کی درخواست کرتے ہوئے لکھتے کہ دعا کیجیے کہ علم و فن کا یہ بے عمل واعظ کچھ دن اور جیتا رہے، کبھی لکھتے کہ معارف جیسے خشک رسالے کی اتنی زندگی بھی بجائے خود داد طلب ہے، کبھی لکھتے کہ معارف جب نکلا تو سنجیدہ ٹھوس، علمی اور محققانہ مضامین کی ملک میں نہ مانگ تھی نہ درآمد تھی، معارف اس غیر مطلوبہ سامان کو لے کر جب بازار میں آیا تو خلاف توقع اس کو پسند کیا گیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، کبھی لکھتے کہ معارف کے احباب کبھی کبھی اس کے مسلک پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں اور اس کی خشکی کے شاکی تو اکثر نکلیں گے لیکن ہر سال ہمیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہنسنے ہنسانے والوں کی تو کمی نہیں، ان کی محفل میں دل بہلا لیجیے لیکن آخر سوچنے سمجھانے والے مشیر کی بھی حاجت ہے یا نہیں، معارف کی اٹھائیسویں جلد شروع ہوئی تو قلم کی زبان سے شکر کا جذبہ لفظوں میں یوں منتقل ہوا کہ ہندوستان خصوصاً اردو دنیا میں کسی رسالہ کا زمانہ کے حوادث سے بچ کر اتنی بھی عمر پا جانا بسا غنیمت ہے، ایسے میں دو سو دسویں جلد کا شروع ہونا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بلکہ بے شمار سجدوں کو واجب کرتا ہے۔ ہاں پہلے چھ مہینوں میں ایک جلد مکمل ہوتی تھی گذشتہ سال سے یہ پورے بارہ شماروں کو شامل ہو گئی۔ البتہ اب ہر ماہ ایک سے اسی تک صفحات کی گنتی رہے گی۔

****

جب رات دن سات آسمان گردش میں ہیں تو کچھ نہ کچھ بپا ہونے کا اندیشہ، انسان کے پریشان ہونے اور گھبرا جانے کے لیے غیر فطری نہیں، چوں کہ گردش ماہ و سال کو قرار نہیں اس لیے گھبرا دینے والی باتوں سے بھی مفر نہیں، ایسے میں سوچنے اور سمجھانے والے مشیروں بلکہ ناصحوں اور خیر خواہوں کی ضرورت بہر حال اپنی اہمیت سے باخبر کرتی رہتی ہے۔ ملک کو آج جن مسائل کا سامنا ہے، ملک کے بیشتر خیر خواہ اس صورت حال سے متفکر ہیں اور تشویش میں بھی ہیں، معاملہ صرف اقتصاد، صحت، روزگار وغیرہ کا ہوتا تو شاید اتنی تشویش نہ ہوتی، اندیشے اس لیے ہیں کہ ملک و قوم کو جھوٹ، مکر، فریب، وعدہ خلافی، ایک طبقہ کے لیے یک طرفہ اور جانب دارانہ رویہ اور دوسرے طبقوں کے لیے کھلے طور پر

معاندانہ رویوں کی بہتات نے اصل مسائل کو نظر انداز کرنے کا جو چلن اختیار کیا ہے اور اس چلن کو جس طرح پھیلایا جارہا ہے، اس سے صاحب فہم و شعور طبقہ کا حیران ہونا اور پریشان ہونا اب اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ یہ کہنے کا جواز ہی نہیں رہا کہ:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

****

اب اسی ایک مہینے کو دیکھئے، اقتدار کے نشے اور اس کے سحر کے اثر سے سارے مسائل کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کو حاکمانہ نصیحت دی جانے لگی کہ وہ پدرم سلطان بود والی ذہنیت کو چھوڑ دیں۔ ہمارے چند دانشوروں کو شاید یہ اتنا برا نہیں لگتا مگر گفتگو میں آگے یہ بھی کہا گیا کہ ہندوؤں نے ہزار برس کی غیر ملکی غلامی جھیلی ہے، یعنی سارے فسانے میں جو بات ہے ہی نہیں ناگواری اسی پر ہے۔ تاڑنے والے تو سمجھ گئے کہ حزب مخالف کے کسی طرح مقبول ہوتے ہوئے عمل نے سر پُر غرور کو حرکت دی۔ ہزار سالہ غلامی کے بعد ملی آزادی کا مطلب کیا، ذرائع ابلاغ و سائل قانون، منہاج تعلیم پر غاصبانہ قبضہ ہے۔ یا پھر صرف اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کی مجرمانہ حرکت ہے؟

****

بداعمالیوں کی سزا تو فطرت کے نظام کا حصہ ہے، کاش نظر اس طرف بھی کی جائے۔ جو موضوع سب سے زیادہ غور و فکر کا محتاج تھا اسے شاطروں نے بڑی مہارت سے ایک گوشہ میں ڈال دیا، خبر آئی کہ اتراکھنڈ میں ایک بستی جوشی مٹھ میں اچانک مکان دھنسنے لگے۔ مضبوط پختہ اور عالیشان عمارتوں میں درار یں اس طرح پڑنے لگیں کہ ہزاروں انسان کے لیے صرف آسمان ہی کی چھت رہ گئی، لوگوں کی باز آبادکاری کی باتیں ہونے لگیں، زمین کے پھٹنے اور اس میں پوری پوری بستی کے سما جانے کی توجیہیں، عقل والوں نے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرنا شروع کر دیں، ان میں ایک مضمون کی سرخی یہ بھی آئی کہ ''صورت حال لوگوں نے دیر سے سمجھی''، یہاں ہم کو جوشی مٹھ کی تفصیلات نہیں بیان کرنا ہے نہ یہ یاد دلانا ہے کہ جوشی مٹھ سے قریب ایک بستی کے ہزاروں باشندوں کے گھروں کے سامنے بلڈوزر کیوں کھڑے کر دیئے گئے، جہاں زمین پر کوئی درار نہیں تھی، وہاں بے گناہوں کو کیوں خوف اور دہشت میں مبتلا کیا گیا۔ کاش اس تناظر میں کسی اخبار کی یہ سرخی اپنی معنویت کو سچائی سے ظاہر کر دے کہ ''صورت حال لوگوں نے دیر سے سمجھی''، ملک میں آج صرف اسی جملہ کو دہرانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ جو ملک کو جنت نشاں بنانے کی داستان ہے، اس کو اگر نفرت کی دراروں

سے مسخ کیا جائے گا اور سرمایہ داری کی جہنم کا ایندھن بننے والوں کو جنگجو بن جانے پر فخر کرنا سکھایا جائے گا تو وقت بہت جلد پھر یہ کہنے کا حق رکھے گا کہ لوگوں نے صورت حال کو سمجھنے میں دیر کر دی، پھر ایسا نہ ہو کہ سارا ملک ہی جوشی مٹھ کی دراروں سے اپنی پہچان بنا لے۔ پہاڑوں پر پڑتی دراروں کا درد خدا نہ کرے کرونا والی وبا بن جائے۔

****

افسوس اس خبر نے کتنے بھولے ہوئے زخموں کو یاد دلا دیا کہ ریاست حیدرآباد دکن کے موجودہ برائے نام ہی سہی نظام ثامن مکرم جاہ نے اپنے ننہیال ترکی میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، ان کی خواہش کے مطابق ان کی آخری آرام گاہ سلطنت آصفیہ کے حکمراں آباءواجداد کے پہلو میں بنائی گئی۔ وہ آخری نظام دکن میر عثمان علی خاں کے پوتے اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید کے نواسے تھے۔ وہی خلیفہ عبدالمجید جنہوں نے علامہ شبلی کو تمغۂ مجیدی سے سرفراز کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے تو خلیفہ ترکی نے ان کو مجیدی پادشاہ کا نام دیا تھا۔ مملکت آصفیہ نہ رہی تو مکرم جاہ بہادر کا دل بھی باہری ملکوں کے قیام سے بہلتا رہا۔ ان کے برادر پرنس مفخم جاہ بحمد للہ اب بھی حیدرآباد کو اپنے وجود سے فرخندہ بنیاد ہونے کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ برسوں دارالمصنّفین کے صدر نشین رہے۔ پرنس مکرم جاہ بہادر کی رحلت پر ہم ان کے اور خاندان آصفیہ کے غم میں شامل اور مغفرت کی دعاؤں میں شریک ہیں۔

****

کرناٹک میں بحر عرب کے ساحل پر بھٹکل نام کی بستی میں عرب نژاد مسلمانوں نے موجوں کے مدوجزر کو صدیوں سے دیکھتے ہوئے جس طرح اپنی زندگیوں میں شامل کر لیا، اس کا اصل اندازہ اس بستی اور اس کے باشندوں کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے، یہ بات اس لیے کہی گئی کہ وہاں کی نئی نسل اردو سے عشق کی نئی کہانیاں لکھ رہی ہے، اس کے لیے وہاں کے بچوں میں اردو کتابوں سے شوق اور مطالعہ کا لطف اٹھانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ حد درجہ تعریف کے قابل اور تقلید کے لائق ہے، اب فروری کے پہلے ہفتے میں وہاں بچوں کا کتابی میلہ منعقد ہو رہا ہے جس کی تیاریاں بتا رہی ہیں کہ وہ عالمی معیار کی شان کا ہوگا۔

****

مقالات

غالب تحقیقی مقدمات کے تناظر میں

ڈاکٹر شمس بدایونی

shamsbadauni@gmail.com

اردو ادب میں مقدمہ نویسی کا آغاز غالباً مولانا الطاف حسین حالی (م:۱۹۱۴ء) سے ہوا۔ ''مقدمۂ شعر وشاعری'' دراصل حالی کے مجموعۂ کلام کا مقدمہ تھا جو پہلی بار ''دیوان حالی'' (مطبوعہ مطبع انصاری، دہلی) کے ساتھ دہلی سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اپنی بے پناہ افادیت، مقصدیت اور ایک نئے قسم کے شعریاتی مطالعے کی جہت اور اصول طے کرنے کے سبب، اس کی علاحدہ کتابی صورت میں اشاعت ہوئی اور تب سے آج تک یہ اردو تنقید کے منشور کے طور پر ادب کے طالب علموں کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔

حالی کے بعد باقاعدہ ایک نثر پارے کے طور پر ''مقدمہ'' کو مقبول عام بنانے اور استحکام دینے میں مولوی عبدالحق (م:۱۹۶۱ء) کے لکھے ہوئے مقدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری (۱۹۱۲ - ۱۹۴۷ء) اور تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان کے تاحیات (۱۹۴۹ء- ۱۶؍اگست ۱۹۶۱ء) صدر رہے۔ اُس وقت یہ واحد ادارہ تھا جو اردو علم وادب کی معیاری کتب نئے طور تحقیق و تنقید سے مرتب ومدون اور ترجمہ کرا کر شائع کر رہا تھا۔ اسی دوران مولوی صاحب نے کچھ اپنی مرتبہ ومولفہ اور کچھ انجمن کی جانب سے لکھوائی گئیں کتب اور بعض معاصرین کی کتابوں پر فرمائشی مقدمات لکھے، جن کی مجموعی تعداد ۵۷ ہے۔ انھوں نے پہلا مقدمہ مولوی ظفر علی خاں (م:۱۹۵۶ء) کی کتاب ''جنگ روس وجاپان'' پر لکھا (مکتوبہ ۱۵؍نومبر ۱۹۰۵ء) اور آخری مقدمہ قاموس الکتب اردو جلد اول (انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۱ء) پر لکھا (مکتوبہ ۲۲؍جون ۱۹۶۱ء)؛ گویا ۵۷ سال میں ۵۷ مقدمات لکھے[1]۔ ان کے لکھے ہوئے مقدمات نے علم وادب کی فضا کو منور کر دیا اور چہار جانب علم وادب

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ یہ تعداد پچھتر کے قریب جا پہنچی ہے۔ مقدمات عبدالحق کے مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کی تلاش سے قاصر رہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ) نے ان مقدمات کو ڈھونڈ نکالا اور وہ انھیں مرتب

سے شغف کے نظارے دیکھنے کو ملنے لگے۔ ان مقدمات میں کتاب، صاحب کتاب اور موضوع کتاب کی اہمیت و قدر و قیمت کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا تھا کہ قاری، مقدمہ پڑھ کر کتاب سے استفادے کو خود پر فرض تصور کرلیتا تھا اور کتاب کے مطالعے میں مستغرق ہو جاتا تھا۔

ابتدا میں مقدمات، تعارفی، علمی اور تنقیدی ہوتے تھے۔ جیسے جیسے کلاسیکی کتب کے متون مرتب کرنے کی روایت پروان چڑھی، مقدموں کا انداز اور اسلوب بدلتا گیا اور جب متن مرتب کرنا باقاعدہ ایک فن قرار پایا اور اسے ایک مستقل نام ترتیب متن، تدوین متن یا متنی تنقید دے کر ادبی تحقیق سے ممیز کر دیا گیا، تب مقدمہ، تدوین متن کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔ یوں تحقیقی و تدوینی مقدمات کا ظہور ہوا۔ حافظ محمود شیرانی (م:۱۹۴۶ء)، مولانا امتیاز علی خاں عرشی (م:۱۹۸۱ء)، قاضی عبدالودود (م:۱۹۸۴ء)، سید مسعود حسن رضوی ادیب (م:۱۹۷۵ء)، مالک رام (م:۱۹۹۳ء)، کالی داس گپتا رضا (م:۲۰۰۱ء)، رشید حسن خاں (م:۲۰۰۶ء) وغیرہ کے مقدمات بیشتر تدوین متن ہی سے متعلق ہیں اور ان کی نوعیت اُن مقدمات سے جداگانہ ہے، جو محض صاحب کتاب کا علمی و ادبی تعارف کرانے اور اس کو وقار و امتیاز عطا کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے مثلاً: نشاط روح مصنفہ اصغر گونڈوی پر مرزا احسان احمد اعظم گڑھی کا مقدمہ، باقیات فانی مصنفہ فانی بدایونی پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ، ریاض رضواں مصنفہ ریاض خیر آبادی پر مولوی سید سبحان اللہ رئیس گورکھپوری کا مقدمہ، دنیائے تبسم مصنفہ شوکت تھانوی پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ وغیرہ۔

غالب اکیڈمی دہلی نے ۲۷؍دسمبر ۲۰۰۵ء کو غالب کے ۲۰۸ویں یوم پیدائش کے موقع پر غالب توسیعی خطبے کا اہتمام کیا۔ خاکسار نے یہ خطبہ بہ عنوان ''غالب تنقیدی مقدمات کے تناظر میں'' پیش کیا تھا۔ اس میں مرزا کے کلام، شخصیت اور فکر و فن پر جو مقدمات تحریر کیے گئے تھے ان کو موضوع بناتے ہوئے تین ممتاز مقدمات پر گفتگو کی تھی۔ مقدمۂ عبدالرحمن بجنوری (مکتوبہ پیشتر نومبر ۱۹۱۸ء)، مقدمۂ سید محمود غازی پوری (مکتوبہ ۱۵؍اکتوبر ۱۹۱۹ء) اور مقدمۂ شاکر حسین نکہت سہسوانی (مکتوبہ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۳۱ء)۔ اول الذکر دو مقدموں نے غالب کو ربّ النوع ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور تیسرے مقدمہ نے غالب کی عظمت کو شعری قواعد و ضوابط کی عدم پیروی کی بنیاد پر ہدفِ تنقیص بنایا تھا۔

کر رہے ہیں۔

یہ خطبہ بغور سنا گیا، بعد میں متعدد جگہ شائع ہوا۔ خاکسار کی کتاب ''تفہیم غالب کے مدارج'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۲۰۱۵ء) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی عنوان کو وسعت دیتے ہوئے تازہ ترین مقالہ ''غالب تحقیقی مقدمات کے تناظر میں'' پیش خدمت ہے۔

آج مطالعۂ غالب اور غالبیات محض تنقیدی نظر و خبر سے ممکن نہیں۔ اب غالب اور غالبیات کا تحقیقی مطالعہ ناگزیر ہے۔ محققین نے جس زیرکی، باریک بینی اور دیدہ سوزی سے غالب کی تصانیف نثر و نظم کو مرتب و مدون کیا ہے، جس تلاش و تفحص سے ان کی سوانح و شخصیت پر کتابیں مرتب و تالیف کی ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس سے استفادہ کیے بغیر کسی تنقیدی نتیجے تک پہنچنے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے۔

غالب پر تحقیقی مقدمات کی تعداد کم و بیش دو درجن ہو گی۔ اگر ان تحریروں کو بھی جنھیں مقدمہ کے مترادف الفاظ: دیباچہ، تمہید، تقریب اور پیش لفظ وغیرہ سے موسوم کیا گیا ہے، مقدموں میں شمار کر لیا جائے تو یہ تعداد اور زیادہ ہو جائے گی۔

راقم کی محدود معلومات میں اب تک غالب پر پہلا تنقیدی مقدمہ عبدالرحمن بجنوری نے اور پہلا تحقیقی مقدمہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے سپرد قلم کیا ہے۔ مولانا عرشی نے اپنی مرتبہ کتاب ''مکاتیب غالب'' (مطبع قیمہ بمبئی، اول ۱۹۳۷ء) میں سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے ''بہ اضافۂ مقدمہ و حواشی'' کا اندراج کیا ہے۔ یہ طویل مقدمہ ۱۷۳ صفحات کو محیط ہے (ص: ۱۱ تا ۱۸۳)۔ لیکن فہرست اور زیر گفتگو مقدمہ کی پیشانی پر لفظ دیباچہ لکھا ہوا ہے۔ راقم الحروف کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کمپوزر کی غلطی ہے لیکن ضمنی عنوانات: دیباچہ کی ضرورت (ص: ۱۲) دیباچہ کے مباحث (ص: ۱۳)، ماخذ دیباچہ و حواشی (ص: ۱۴) کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مولانا عرشی نے اپنی اس تحریر کو دیباچہ ہی کا عنوان دیا تھا۔ اس تحریر کا آخری جملہ میرے خیال کی تائید کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: دیباچہ کے مباحث نے امید کے خلاف کافی وقت لے لیا اس لیے اس عذر کے ساتھ سلسلۂ کلام ختم کرتا ہوں (ص: ۱۸۳)۔ ظاہر ہے کہ اتنے صریح اعلان کے بعد اسے مقدمہ لکھنا اور سلسلۂ غالبیات کا پہلا تحقیقی مقدمہ قرار دینا شاید درست نہیں ہو گا حالانکہ اپنے محتویات کے لحاظ سے یہ مقدمہ سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ اسی طرح کا ایک اندراج ''نادرات غالب'' (کراچی ۱۹۴۹ء) از آفاق حسین آفاق میں بھی نظر سے گزرا جس کے سرورق پر مقدمہ کا اندراج ہے لیکن اندر پیشانی تحریر پر تمہید لکھا ہے۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے ٹائٹل یا سرورق کے ڈیزائن اور اندراجات سے یہ مصنّفین ناواقف رہے ہوں گے، لہٰذا یہ

قیاس کرنا بھی ایک حد تک درست ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ دیباچہ و تمہید کو مقدمہ کا مترادف خیال کرتے ہوئے ان میں کسی امتیاز و فرق کے قائل نہ ہوں[۲1] واللہ اعلم۔

مالک رام کی کتاب ''ذکر غالب'' (دہلی ۱۹۳۸ء) بھی دراصل ''سبد چیں'' کا دیباچہ تھا، جو طویل ہو جانے کے سبب اس میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ علاحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ ذکر غالب طبع پنجم (دہلی ۱۹۷۶ء) میں مالک رام نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے (ص:۹)۔ اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام اس وقت تک متن پر تعارفی تحریروں کے لیے لفظ ''مقدمہ'' کا استعمال شاید پسند نہیں کرتے تھے۔ خود مولوی عبدالحق کے پہلے مقدمے کے طور پر جس مقدمہ کو پیش کیا جاتا ہے، اس پر بھی مقدمہ کی جگہ لفظ ''تمہید'' ثبت ہے، لیکن مقدمات عبدالحق میں جب یہ شامل کیا گیا تو مولوی عبدالحق نے اسے مقدمات کے تحت شامل کرنے پر اعتراض نہیں کیا۔

اس مقالے میں قدرے تفصیلی تعارف و تجزیے کے لیے راقم الحروف کا ہدف شروع میں تین مقدمات تھے:

(۱) مقدمۂ دیوان غالب نسخۂ عرشی، از امتیاز علی خاں عرشی، مکتوبہ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء، بعد نظر ثانی، ۲۵؍مارچ ۱۹۷۱ء

(۲) مقدمۂ غالب کے خطوط، از ڈاکٹر خلیق انجم، مکتوبہ ۶؍جنوری ۱۹۸۴ء

---

[۲] نہ معلوم کیوں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ قلم کار دیباچہ کی جگہ لفظ مقدمہ کا استعمال درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی چار مثالیں مولانا عرشی کے مرتبات میں ملتی ہیں:

(۱) مکاتیب غالب، مطبوعہ ۱۹۳۷ء، دیباچہ ۱۷۳، صفحات ۱۸۳۔۱۱

(۲) انتخاب غالب، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، دیباچہ ۳۱، صفحات ۴۰-۱۰

(۳) فرہنگ غالب، مطبوعہ ۱۹۴۷ء، دیباچہ ۱۹، صفحات ۸-۲۷

(۴) دیوان غالب، مطبوعہ ۱۹۵۸ء، دیباچہ ۱۲۰، صفحات ۱۲۰۔۱

حالانکہ یہ دیباچے تدوینات پر لکھے جانے والے مقدمات ہی کے مماثل ہیں، انھیں مقدمہ کہنا اور لکھنا کسی طور بھی غلط نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے مذکورہ بالا دیباچوں کے بیانات کو نقل کیا ہے یا ان کا حوالہ دیا ہے، انھوں نے دیباچے کی جگہ لفظ مقدمہ ہی کا اندراج کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنی کتاب مقدماتی ادب (دہلی ۲۰۱۹ء) میں اس مسئلے پر گفتگو کی ہے اور لفظ دیباچہ، پیش لفظ، تقریب، تعارف وغیرہ کو مقدمہ کا مترادف قرار دیا ہے (ص ۷۵ تا ۱۱۲)۔

(۳) مقدمہ گنجینۂ معنی کا طلسم، از رشید حسن خاں، مکتوبہ ۱۶؍اپریل ۲۰۰۵ء

لیکن مقالے کے طویل ہو جانے کے خوف سے ہم نے صرف ایک مقدمہ ہی تک قلم کو محدود کر لیا۔ قبل اس کے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کے تحریر کردہ مقدمے پر سلسلۂ گفتگو شروع کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب پر لکھے جانے والے تحقیقی مقدمات کے ارتقائی سفر پر بھی مختصراً گفتگو کر لی جائے۔

غالب پر لکھے جانے والے مقدمات میں پہلا تحقیقی مقدمہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (م:۱۹۷۲ء) کا نوشتہ ہے جو مولوی مہیش پرشاد (م:۱۹۵۱ء) کے مرتبہ ''خطوط غالب'' (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۱ء) پر لکھا گیا، مکتوبہ ۱۰؍مارچ ۱۹۴۱ء۔ عبدالستار صدیقی نے اس مجموعے کے متن کی نظرثانی اور چھپائی کی نگرانی کی تھی، لہٰذا ان کا حق بنتا تھا کہ وہ اس پر مقدمہ لکھیں۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل اس مقدمے میں، متن کی تصحیح، تصحیح کے مآخذ، اغلاط کتابت، روش املا اور تصحیح کتابت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ تصانیف غالب میں پائی جانے والی املا اور روش کتابت کی اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غالب کی کوئی تصنیف ان کی نگرانی میں نہیں چھپی۔ زیادہ سے زیادہ کاپی آتی تو وہ بنا دیتے کاپی نویس نہ بناتا۔ غلط الفاظ جوں کے توں رہتے۔ جو لوگ چھاپے کے ذمہ دار تھے انھوں نے ہمیشہ بے پروائی سے کام لیا اور غالب عمر بھر کاتبوں کے ظلم کی فریاد کرتے رہے۔ (ص:۹)

اس مقدمے کے سارے بیانات متن پر نظرثانی سے متعلق ہیں۔ عام قاری کے لیے دلچسپ اور معلوماتی حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے غالب کے خطوط سے املا سے متعلق ان کی ہدایات و تنبیہات کی مثالیں جمع کر دی ہیں اور ان پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔

دوسرا اہم مقدمہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نوشتہ ہے، جو ان کی کتاب ''متفرقات غالب'' (مطبوعہ ہندوستانی پریس، رامپور ۱۹۴۷ء) میں شامل ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب کو اپنے ذاتی کتب خانے میں مخزونہ ایک بیاض میں مرزا کے پانچ مکتوب الیہ کے نام ۴۹ خطوط اور چند منظومات ملیں، جن کا تعلق غالب کے کلکتہ کے دوران قیام سے تھا۔ یہ ایک ایسا نادر معلومات افزا مواد تھا جو غالب کے سفر کلکتہ کے احوال اور متعلقات سفر پر بھرپور روشنی ڈالتا تھا۔ مسعود حسن رضوی نے اسے مع مقدمہ مرتب کر دیا۔ مقدمے میں بیاض کا تعارف، بیاض میں مندرج خطوط اور ان کے مکتوب الیہ کے احوال اور مرزا سے ان کے تعلق کی نوعیت، کلکتہ میں پیش آئے معرکے اور بیاض میں موجود کلام پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے تفہیم غالب میں اس مواد کی اہمیت کو آشکارا کیا گیا ہے۔ مقدمے پر تاریخ تحریر کا اندراج نہیں ہے۔ یہ صفحہ نمبر: ۱۰ سے ۳۳ کو محیط

ہے۔ مقدمہ مسلسل ہے، ذیلی عنوانات نہیں قائم کئے گئے ہیں۔

تیسرا قابل ذکر مقدمہ مولوی غلام رسول مہر (م:۱۹۷۱ء) کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے یہ مقدمہ اپنی تالیف خطوط غالب جلد اول (کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء) پر بحیثیت جامع خطوط لکھا تھا۔ مکتوبہ ۱۴، مئی ۱۹۵۱ء، یہ مقدمہ ۴۹ صفحات کو محیط ہے۔ اسے بغیر کسی تمہید کے ۳۳ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ترتیب متن سے متعلق صرف چھ عنوانات ہیں، باقی عنوانات کا تعلق غالب کی ادبی و شعری شخصیت، تصانیف اور خصوصیات خطوط سے ہے۔

غلام رسول مہر نے خطوط غالب کی دو ضخیم جلدیں مرتب کی تھیں، لیکن یہ ان کی کتاب ''غالب'' (لاہور ۱۹۳۶ء) کی طرح مقبول نہ ہو سکیں۔ اغلاط کتابت و متن اس کی مقبولیت میں مزاحم ہوئیں بایں سبب اس کا مقدمہ بھی بہت زیادہ مقتبس نہیں کیا جاسکا۔

غلام رسول مہر کے بعد غالب صدی ۱۹۶۹ء تک جو مقدمات مطالعۂ غالب کو وسعت، مقبولیت اور توانائی سے ہم کنار کر سکے ان میں یہ چند قابل ذکر ہیں:

مقدمۂ دیوان غالب نسخۂ مالک رام (آزاد کتاب گھر، دہلی، اول ۱۹۵۷ء)۔ اس کا متن غالب کی زندگی میں مطبوعہ نسخۂ نظامی کانپور (۱۸۶۲ء) پر مبنی ہے۔ اس میں نسخۂ حمیدیہ کا غیر متداول کلام اور تتمہ عنوان کے تحت، کچھ نو دریافت کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ مالک رام نے اس پر ۳۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ بھی لکھا (ص:۷ تا ۳۶) جس نے شیدائیان غالب کو از حد متاثر کیا۔ نتیجتاً ایک ہی سال (۱۹۵۷ء) میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ کلام غالب سے رغبت، شغف اور شوق پیدا کرنے میں مالک رام کے اس مقدمے کی حصہ داری کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مقدمہ ۳۰، مارچ ۱۹۵۷ء کا مکتوبہ ہے۔ اس طور یہ مقدمہ، دیوان غالب نسخۂ عرشی مکتوبہ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء پر زمانی فوقیت رکھتا ہے۔ اسی نسخے کے صدی ایڈیشن ۱۹۶۹ء پر رشید حسن خاں کے سخت تبصرے بہ عنوان ''دیوان غالب، صدی ایڈیشن'' (مشمولہ: ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ ۱۹۷۸ء) نے بھی اس کی شہرت کو دوچند کر دیا۔ رشید حسن خاں کے اس تبصرے سے مالک رام کے علمی وقار کو ضرور دھچکا لگا لیکن اس تبصرے کی اشاعت کے بعد بھی دیوان غالب نسخۂ مالک رام کی خواندگی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ مالک رام کا سلیقۂ تالیف اور دلنشیں، شگفتہ اور رواں اسلوب تحریر تھا جو تحقیقی ہوتے ہوئے بھی تحقیق کے بوجھ سے عاری تھا۔

انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتبہ ''دیوان غالب اردو نسخۂ عرشی'' ۱۹۵۸ء میں پہلی بار شائع کیا۔ اس پر مولانا عرشی نے ۱۲۰ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا۔ مکتوبہ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء،

جسے ''دیباچہ'' کا عنوان دیا، لیکن طبع دوم (۱۹۸۲ء) میں مزید بیس صفحات کے اضافے کے ساتھ اسے ''مقدمہ'' کا عنوان دیا۔ مکتوبہ ۲۵، مارچ ۱۹۷۱ء۔ یہ مقدمہ ۸۳ ذیلی سرخیوں کے تحت غالب کی شعری شخصیت: آغاز شاعری، رویۂ شاعری، تتبعِ شاعری، موضوعاتِ شاعری، کل اردو سرمایۂ شاعری (۴۸ ذیلی عنوانات) اور تدوین متن کے اصول و طریقہ کار (۳۵ ذیلی عنوانات) پر بسیط، عالمانہ، محققانہ، ناقدانہ اور بنیادی واصولی گفتگو کرتا ہے۔ تصانیف غالب پر اب تک جو مقدمات لکھے گئے ان میں یہ مقدمہ تحقیق، تدوین، تنقید، املا، رموزِ اوقاف، اصول تحقیق وتدوین، اخلاقیات تحقیق اور شگفتہ زبان وبیان ہر لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تنقید میں جو حیثیت مولانا حالی کے مقدمہ ''شعر وشاعری'' کو حاصل ہے، تدوین متن میں وہی اہمیت مولانا عرشی کے مقدمہ کو دی جاتی ہے۔ جس طرح حالی کا مقدمہ اردو تنقید کا منشور بن چکا ہے، بعینہ اردو محققین کے نزدیک مولانا عرشی کا مقدمہ تدوین متن کی شریعت میں ایک صحیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا عرشی نے غالب کے دیوان فارسی کی تدوین کا بھی بیڑا اٹھایا تھا مگر بہ وجوہ یہ کام مکمل نہیں ہو سکا۔ اس کے مقدمے کے مباحث کا وہ حصہ جس میں کلام فارسی کی تدوین وطباعت زیر بحث آئی ہے انھوں نے بہ عنوان: ''مقدمہ دیوان غالب فارسی (نسخۂ عرشی) کے چند اوراق'' شائع کرادیا تھا (ماہنامہ ''شاعر''، بمبئی، غالب نمبر، فروری-مارچ ۱۹۶۹ء)۔ یہ مقدمہ امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی مرتبہ ثاقب عمران (ناشر رضا لائبریری رامپور ۲۰۱۸ء) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

غالب صدی کے دوران ۱۹۶۹ء اور اس کے بعد تصانیف غالب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ بعض خطی نسخے مثلاً ''دیوان غالب بخط غالب'' اور ''گلِ رعنا مع آشتی نامہ''، ''نامہ ہائے فارسی غالب'' کی دریافت اور ان کی متعدد اشاعتیں؛ غالب کے دوسرے خطی نسخوں کی عکسی وتدوینی اشاعتیں وغیرہ وغیرہ کو بھی اگر شامل کرلیا جائے تو میں اپنے ہدف ''مقدمۂ غالب کے خطوط'' تک پہنچنے میں ناکام رہوں گا۔

میرا خیال ہے کہ غالب پر تحقیقی مقدمہ نگاری کے ارتقائی سفر کو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا مختصر روداد کافی ہے۔ غالب صدی کے بعد لکھے جانے والے مقدمات کے لیے علاحدہ مقالہ لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ راقم الحروف نے ۲۰۱۹ء میں ''غالب صدی کے بعد دیوان غالب کی قابل ذکر اشاعتیں'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا، جس میں کم وبیش ایک درجن دیوان غالب کی اشاعتیں زیر تحریر آئی تھیں (مطبوعہ: اردو دنیا، دہلی، جولائی ۲۰۱۹ء)۔ تاہم اس دوران لکھے جانے والے دو تین مقدمات کا ذکر

کردینا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے تفہیم کلام غالب، تحقیق غالب اور تدوین غالب کے امکانات کو روشن کیا اور انھیں نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ میری مراد ''دیوان غالب بخط غالب نسخۂ عرشی زادہ'' (دہلی ستمبر ۱۹۶۹ء) پر اکبر علی خاں عرشی زادہ (م:۱۹۹۷ء) کے ۲۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ سے ہے (ص:۱۲تا۳۱) جس نے ''بیاض غالب بخط غالب'' کی بحث کو فیصلہ کن شکل دی۔ اسی طرح سید قدرت نقوی (م:۲۰۰۰ء) کا مرتبہ ''گل رعنا مع آشتی نامہ'' (کراچی ۱۹۷۵ء) کا مقدمہ جو ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے جو گل رعنا اور اس سے متعلق جملہ دستیاب نسخوں کے حوالے سے حتمی تحقیق پیش کرتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا، مالک رام کی طرح دوسرے ماہر غالبیات ہیں۔ مالک رام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور کالی داس گپتا رضا، تینوں نے دیوان غالب کی تدوین کی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کا ''دیوان غالب کامل نسخۂ رضا تاریخی ترتیب سے'' (بمبئی اول ۱۹۸۸ء) نسخۂ عرشی کی طرح بڑا کارنامہ ہے۔ اس کا مقدمہ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ (بار دوم ص:۱۵تا۱۲۸) جس میں کلام غالب کی تاریخی ترتیب اور اس کے اطراف و متعلقات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ زیر نظر ذیلی عنوانات سے اس مقدمے کی اہمیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> کلام غالب کی تاریخی ترتیب کیوں، تعارف، غالب کا اولین اردو منظوم کلام، عمدۂ منتخبہ میں ذکر غالب، حرف نامعتبر، غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر، غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر، دیوان غالب طبع اول، غالب کی زندگی میں دیوان غالب کی اشاعت، توقیت غالب۔

مولانا عرشی کے مقدمے کے بعد اس مقدمے کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ یہ کلام غالب کے تاریخی تسلسل کو سمجھنے میں پوری طرح معاون ہوتا ہے۔

غالب جس مشکل پسندی کے لیے مشہور ہیں اس میں علاوہ مضمون کی پیچیدگی کے، ان کی وضع کردہ تراکیب لفظی کا بھی بڑا دخل ہے۔ رشید حسن خاں نے ان کے دیوان اردو کا لفظی اشاریہ بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ غالب کا یہ دعویٰ سو فیصد درست ہے کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

یہ اشاریہ باسم ''گنجینۂ معنی کا طلسم''، تین جلدوں میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے شائع ہوا۔ اس کی جلد

اول مطبوعہ ۲۰۱۷ء پر ۲۲ صفحات کا مقدمہ ہے (۸تا۳۰) مکتوبہ ۱۶؍اپریل ۲۰۰۵ء۔ مقدمے کے آٹھ ذیلی عنوانات ہیں: بنیادی مآخذ، املا، ترتیب الفاظ، بہ سلسلۂ مرکبات، چند وضاحتیں، استثنا، غیر معتبر کلام۔

غالب کے اردو دیوان میں کتنے مفرد اور کتنے مرکب لفظ ہیں اور یہ اپنے استعمال سے کن معنوی جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ایک ہی لفظ کے مختلف مرکب شعر میں کن معنوی وسعتوں اور شعری رنگارنگیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان کی استعمال کی نوعیت کیا ہے اور ان کو غالب نے کب، کہاں، کتنی بار، کس شعر میں استعمال کیا ہے؛ ان تمام باتوں کو مقدمہ میں مع صراحت وضاحت پیش کرتے ہوئے اس سلسلے کے بنیادی مآخذ، اشاریہ اور الفاظ کی ترتیب کے طریقہ کار، املا، او قاف وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔

یہ مقدمہ عالمانہ بصیرت کا ثبوت پیش کرتا ہے اور لفظیات غالب پر ایک ایسا انفرادی محاکمہ پیش کرتا ہے جو محققین سے زیادہ ناقدوں کے لیے مفید مطلب ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم (م: ۲۰۱۶ء) ہمارے دور کے معروف غالب شناس ہیں۔ انھوں نے غالب سے اپنی دلچسپی اور شغف کا اظہار ۱۹۶۱ء میں ''غالب کی نادر تحریریں'' مرتب کرکے دیا۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی دوسری کتاب ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' آئی۔ ۱۹۸۴ء میں ''غالب کے خطوط'' جلد اول کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۹۱ء میں ''غالب کچھ مضامین'' اور ۲۰۰۵ء میں ''غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' شائع ہوئی۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے (بہ استثنا غالب کچھ مضامین) یہ کتابیں منفرد ہیں۔ خصوصاً ''غالب کے خطوط'' نے کلیات خطوط غالب کی حیثیت حاصل کرکے خطوط غالب کے دستیاب جملہ مجموعوں سے بے نیاز کردیا ہے۔

یوں تو خلیق انجم نے ''غالب کی نادر تحریریں'' کتاب پر بھی تقریباً بیس صفحات کا مقدمہ لکھا تھا، لیکن غالب کے خطوط جلد اول پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ اپنی ضخامت اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے خطوط غالب کا بھرپور تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔

غالب کے خطوط جلد اول، طبع ثانی (مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۹۳ء) پیش نظر ہے۔ مرتب نے اس میں حرف آغاز (طبع اول و دوم) کے بعد مقدمہ بہ عنوان: ''کچھ اس تنقیدی ایڈیشن کے بارے میں'' (ص ۱۳تا۱۲۸) شامل کیا ہے۔ یہ مقدمہ ۱۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ مولانا عرشی کی طرح خلیق انجم نے اسے کوئی اصطلاحی عنوان: دیباچہ، تمہید، پیش لفظ، پیش گفتار وغیرہ نہیں دیا۔ جو عنوان دیا ہے، وہ

طوالت تحریر اور وسعت معلومات کے لحاظ سے لفظ ''کچھ'' کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بایں سبب راقم الحروف نے اسے مقدمہ کی صورت میں قبول کرتے ہوئے اپنے مطالعے کا حصہ بنالیا۔

یوں تو تدوین متن سے متعلق جملہ کتب پر تحقیقی مقدمہ ہی لکھا جاتا ہے لیکن مرتب نے اس کے دو حصے کیے ہیں: پہلا تحقیقی اور دوسرا تنقیدی۔ دوسرے حصے کو انھوں نے مستقل ایک عنوان: ''خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ'' دیا ہے۔ مقدمے کو جن ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے مقدمے کی نوعیت و کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

تحقیقی حصہ: کچھ اس تنقیدی ایڈیشن کے بارے میں (۱۳تا۲۲)، خطوط غالب کے مختلف ایڈیشن اور ری پرنٹ (۲۳تا۵۹)، غالب کی اردو املا کی خصوصیات (۶۰تا۶۷)، غالب کی زبان پر فارسی کے اثرات، انگریزی الفاظ کا استعمال (۷۷تا۹۲)، غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد (۹۳تا۹۷)۔ یہ حصہ ۸۹ صفحات پر محیط ہے۔

خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ: غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ اور اردو مکتوب نگاری کا آغاز (۱۰۱تا ۱۳۶)، غالب کا پہلا دستیاب اردو خط (۱۷۷-۱۲۳)، مکتوب نگاری کا فن (۱۲۴تا۱۳۶)، شگفتن گل ہائے ناز (۱۳۷-۱۷۱)، بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (۱۷۲-۲۲۸)۔

یہ وہ عنوانات ہیں جو مقدمے میں علاحدہ علاحدہ جلی سرخی کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ ہر عنوان کی متعدد ذیلی سرخیاں ہیں۔ ان سرخیوں کی مدد سے یہ مقدمہ خطوط غالب اور اس کے متعلقات، تدوین سے متعلق جملہ معاملات کو صراحت و وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ البتہ مقدمہ نگار تدوین متن کے اس اصول سے انحراف کرتا نظر آتا ہے جس کے تحت مقدمہ نگار کو تنقیدی بحث سے گریز کرنا چاہیے۔ تنقید سے متعلق یہ حصہ تحقیقی حصے سے قدرے طویل یعنی ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ عنوانات کے بموجب مقدمے میں متعدد مباحث ہیں۔ یہاں صرف دو تین اہم مباحث اور نکات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

خلیق انجم نے اپنے اس مقدمے میں غالب کے اُن ۲۱،اہم مجموعہ ہائے خطوط کا تعارف پیش کیا ہے جو ان کی ترتیب و تدوین سے قبل مرتب و مدون ہو چکے تھے۔ اس تعارف میں انھوں نے بعض نسخوں (مکاتیب غالب، خطوط غالب، نادرات غالب وغیرہ) کی تعریف و تحسین کی ہے لیکن دوسرے مجموعوں کی ترتیب کے نقائص کی طرف بہ دلائل متوجہ کیا ہے۔ اس دوران تدوین کے وہ اصول بھی زیر بحث آئے ہیں جنھیں مرتبین اپنے اپنے مرتبات میں بروئے کار نہیں لا سکے اور املا سے متعلق یہ

بحث بھی زیر گفتگو آئی کہ ترتیب کے دوران جدید املا یا وہ املا جو مصنف کے متن میں اختیار کیا گیا، کون سا قابل ترجیح ہے؟ وہ لکھتے ہیں:

> میں اس حق میں ہوں کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے کیوں کہ اول تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کر رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ تنقید نگار کا مقصد متن کی بازیافت ہے۔ املا کی بازیافت ہر گز نہیں۔(ص:۱۹)

خطوط غالب کے حوالے سے چند تنقیدی مفروضات کا بھی انھوں نے بہ دلائل رد کیا ہے۔ مثلاً یہ بیانات دیکھیے:

> غالب جدید اردو نثر کے موجد ہر گز نہیں تھے کیوں کہ ان کی نثر نگاری کے آغاز سے تقریباً پچاس سال قبل اردو نثر جدیدیت کے راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔(ص:۱۰۸)
>
> جوش عقیدت میں ہمارے بہت سے ناقدین نے اردو مکتوب نگاری کا موجد غالب کو قرار دے کر مکتوب نگاری کی تاریخ ہی غالب سے شروع کر دی۔(ص:۱۰۹)

ان مفروضات پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ اردو مکتوب نگاری میں کس نے پہلی بار طرز جدید کو اختیار کیا؟''(ص:۱۰۹)

اس سلسلے میں وہ ماسٹر رام چندر (م:۱۸۸۰ء) کا مکتوب نگاری سے متعلق ایک ہدایتی نوٹ اور ''پنج آہنگ'' کے آہنگ اول سے غالب کے اصول مکتوب نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جدید طرز پر مکتوب نگاری کے آغاز کا سہرا نہ تو ماسٹر رام چندر کے سر باندھا جا سکتا ہے اور نہ غالب کے سر... طرز جدید کا شعور عام ہو چکا تھا... لیکن غالب کے خطوط اردو مکتوب نگاری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔(ص:۱۰۹)

انھوں نے غالب کی املا پر بھی طویل گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے کے ان کے یہ مختصر بیانات قابل ذکر ہیں، ''دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کے تمام الفاظ ٹھیک اسی طرح لکھے جاتے ہیں جس طرح ان کا تلفظ ادا کیا جاتا ہے''(ص:۶۰)۔ عہد غالب میں اردو املا کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور اردو املا میں سب سے زیادہ تبدیلیاں اسی عہد میں رونما ہوئیں(ص:۶۱)۔ غالب کی اردو تحریروں میں پرانی املا بھی ملتی ہے اور وہ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں جو اس عہد کے املا میں ہو رہی تھیں(ص:۶۲)۔ غالب نے بعض الفاظ کی املا اپنے عہد کے رائج املا سے اس طرح مختلف کی ہے کہ ہم اسے غلط املا کہنے پر مجبور ہیں(ص:۷۵)۔

خطوط غالب کی مجموعی تعداد پر بھی انھوں نے مقدمے میں گفتگو کی ہے۔ طبع اول ۱۹۸۴ میں درج

کردہ تعداد خطوط کو کالعدم قرار دیتے ہوئے انھوں نے ۹۲ مکتوب الیہم (جن میں پانچ نامعلوم ہیں) کے نام ۸۸۶ خطوط کی نشاندہی کی ہے (ص:۹۷)۔ لیکن یہ تعداد غالب کے خطوط جلد ۵ مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء میں ۸۹۴ ہو گئی ہے (ص:۱۶۵)، یعنی آٹھ خطوط کا مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں (م:۲۰۱۲ء) نے اپنی کتاب توقیت غالب (دہلی ۱۹۹۹ء) میں اکتوبر ۱۹۹۴ء تک دستیاب خطوط کی تعداد ۸۹۲ دی تھی۔
غالب نے پہلا اردو خط کب لکھا؟ اس پر مختلف آرا ہیں۔ خلیق انجم نے اس سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے:

غالب کے پہلے اردو خط کی نشاندہی کرنا کسی طرح ممکن نہیں، البتہ غالب کے اس پہلے اردو خط کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ (ص:۱۱۸)

اس سلسلے میں انھوں نے تین خطوط کی نشاندہی کی ہے:

خط بنام ہر گوپال تفتہ، مکتوبہ اگست ۱۸۴۹ء، نشان دہندہ: مولوی مہیش پرشاد
خط بنام جواہر سنگھ جوہر، مکتوبہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء، نشان دہندہ: مولوی غلام رسول مہر
خط بنام ہر گوپال تفتہ، مکتوبہ اوائل ۱۸۴۷ء، نشان دہندہ: خلیق انجم

نہ جانے کیوں ڈاکٹر خلیق انجم نے منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی (م:۱۸۶۰ء)، تلمیذ غالب کے نام غالب کے خط مکتوبہ ۹، مارچ ۱۸۴۸ء کا ذکر نہیں کیا، جو نادرات غالب از آفاق حسین آفاق (کراچی ۱۹۴۹ء، حصہ دوم، ص:۲) میں شامل ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ اس مجموعۂ خطوط سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے مقدمہ میں مجموعہ ہائے خطوط غالب کے ضمن میں اس کا تعارف بھی کرایا ہے (ص:۵۱)۔ غالباً یہ خط سہواً ان کی نظر سے نہیں گزر سکا۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنی کتاب توقیت غالب میں منشی نبی بخش حقیر کے نام اسی خط مکتوبہ ۹، مارچ ۱۸۴۸ء کو غالب کا پہلا اردو خط قرار دیا ہے (ص:۷۲)۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں خلیق انجم نے حتمی رائے دینے سے گریز کیا ہے۔

تنقیدی حصے میں انھوں نے غالب کے خطوط کی وہ خصوصیات بیان کی ہیں جن سے عام طور پر سبھی متعارف ہیں، یعنی خطوط کی علمی و ادبی حیثیت، ان کا اچھوتا اسلوب وغیرہ جس سے ہم صرف نظر کرتے ہیں۔

اس مقدمے کی خصوصیت یہ ہے کہ ادب کا ایک عام طالب علم اور اسکالر دونوں، بیک وقت خطوط غالب کی جمع آوری کی روداد (از اول تا ایں دم)، مشکلات، اختلافات، جملہ اہم مجموعہ ہائے خطوط اور ان کی متعدد اہم اشاعتیں، جملہ دستیاب خطوط کے عکس، خطوط کی تاریخیں، املا، رقمیں، بنیادی نسخے، خطوط کے

جملہ مآخذ، جملہ خطوط اور مکتوب الیہم کی تعداد، خطوط کی علمی و ادبی حیثیت اور اسلوب کی رنگارنگی سے واقف ہو جاتے ہیں۔

کسی بھی بڑے تحقیقی و تدوینی کام میں اغلاط و تسامحات کا راہ پا جانا، یا ایسے پہلوؤں کا ذکر آجانا جن سے اختلاف کرنے کی معقول وجوہ موجود ہوں، کوغیر فطری نہیں کہا جا سکتا۔ خلیق انجم نے بڑا کام کیا۔ ان کے پیش نظر تدوین متن کے اصول بھی تھے اور ان سے اعتنا نہ کرنے کی مثالیں بھی۔ اردو میں تدوین متن کے اصول اور طریقۂ کار پر پہلی کتاب (متنی تنقید، مطبوعہ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۶۷ء) کے وہی مصنف بھی تھے، لیکن خطوط غالب کی تدوین کے دوران انتہائی محتاط رہتے ہوئے بھی وہ ان تسامحات کا شکار ہو گئے جن پر وہ اپنے پیش رو مرتبین خطوط غالب کی سخت گرفت کر چکے تھے۔

پروفیسر حنیف نقوی (م: ۲۰۱۲ء) نے جلد اول پر تین قسطوں میں بہ عنوان: ''غالب کے خطوط ایک جائزہ'' طویل تبصرہ کیا ہے (ڈیمائی سائز کے ۹۱ صفحات)۔ جس میں بیشتر موضوع بحث مقدمہ اور اس میں شامل خطوط کے اقتباسات رہے ہیں۔ انھوں نے عود ہندی اور اردوئے معلی کے مختلف ایڈیشنوں کے کتابی کوائف کے اندراجات سے اختلاف، اردو املا سے متعلق بحث اور نثر غالب پر فارسی زبان کے اثرات کے تحت غالب کے یہاں لفظوں کے استعمال کی نوعیت، مواقع اور اعداد و شمار سے متعلق خلیق انجم کے متعدد نتائج اور دعوؤں کا بہ دلائل رد کیا ہے۔ یہ طویل تبصرہ ایک مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے دوماہی آرگن ''اکادمی'' میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ قسط اول ستمبر-اکتوبر ۱۹۸۶ء، دوم نومبر-دسمبر ۱۹۸۶ء، سوم جنوری-فروری ۱۹۸۷ء۔[۳]

اسے اتفاق کہیے کہ ''اکادمی''، لکھنؤ (جولائی، اگست ۱۹۸۶ء) کے شمارے میں حنیف نقوی کا ایک اور تبصرہ بہ عنوان ''تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر'' شائع ہوا تھا جس میں تلامذۂ غالب (دوم ۱۹۸۴ء) کے بعض تسامحات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ خلیق انجم نے موقع غنیمت جانا اور اپنے اختلاف و انتقام کو منجانب مالک رام کر دیا جبکہ مالک رام اسی ایڈیشن میں حنیف نقوی کے تعاون کا اعتراف کر چکے تھے۔ خلیق انجم نے ماہنامہ ''شانِ ہند''، دہلی کے مدیر سرور تونسوی کے قلم سے ایک تحریر نومبر ۱۹۸۶ء کے

---

[۳] ان قسطوں کی تلاش ایک عرصہ سے تھی۔ نقوی صاحب کی حیات میں کئی بار ان سے ان قسطوں کے عکس حاصل کرنے کی کوشش کی گئی مگر انھوں نے اس فرمائش کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا۔ جناب محسن خان (لکھنؤ) کا شکر گزار ہوں کہ ان کی کوشش سے اکادمی کی لائبریری سے یہ عکس حاصل ہوئے۔

شمارے میں شائع کرائی جس کا عنوان تھا: ''اردو کے ہندوادیبوں کے خلاف منظم سازش (حنیف نقوی نامی ایک شخص کی دریدہ دہنی)''۔اس مضمون میں حنیف نقوی کے اس عمل کو سستی شہرت حاصل کرنے، بزرگوں کی ٹوپی اچھالنے، غنڈہ گردی اور ادبی سازش سے تعبیر کیا ہے۔آخر میں لکھا ہے:

> آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتے ہیں کہ اکادمی ایک سرکاری ادارے کا رسالہ ہے۔اس میں کسی بھی قیمت پر غنڈہ گردی اور شرفا کی ٹوپی اچھالنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ہم اترپردیش کے گورنر، وزیراعلیٰ و وزیر تعلیم اور دوسرے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر اس ادبی غنڈہ گردی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرارہے ہیں۔(ص:۷)

اس غیر علمی اور غیر شائستہ زبان کے حنیف نقوی متحمل نہیں ہوسکے۔بعض بزرگوں کی مداخلت کے سبب انھوں نے غالب کے خطوط کی دوسری جلدوں پر لکھنے سے اجتناب کیا۔

پروفیسر نذیر احمد (م:۲۰۰۸ء) نے بھی ایک مقالے میں ''غالب کے خطوط'' میں درآئے بعض فارسی اشعار کے صحیح متن اور تخریج پر گفتگو کی تھی۔یہ بڑا معلومات افزا مقالہ تھا۔افسوس اس وقت اس کا حوالہ دینے سے قاصر ہوں۔

اس طور یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطوط غالب پر خلیق انجم کا مقدمہ حرف آخر نہیں،ہاں یہ خطوط پر اب تک لکھے جانے والے مقدمات میں زیادہ مفصل، خطوط غالب اور ان کی تدوین کے جملہ مسائل پر حاوی ہے۔حنیف نقوی و پروفیسر نذیر احمد کے اعتراضات واصلاحات کے باوجود اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عبدالسلام ندوی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد

صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی

abdullahimteyaz4@gmail.com

اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں دارالمصنفین ،اعظم گڑھ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس ادارے نے علم وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔دارالمصنفین کے قیام کا خاکہ علامہ شبلی نے اپنی حیات میں ہی تیار کر لیا تھا مگر وہ اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کو پورا کیا اور علامہ شبلی کی وفات کے دو روز بعد ہی دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا۔اس ادارے کو قائم کرنے کے پیچھے علامہ شبلی کا مقصد یہ تھا کہ علما وادبا کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو اپنے مذہب وملت اور زبان وادب کی خدمت کر سکیں جیسا کہ ڈاکٹر خورشید نعمانی لکھتے ہیں:

> وہ مخلص کام کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے مذہب، اپنی ملت، اپنے تمدن، اپنی تاریخ اور اپنی زبان وادب کی خاموش خدمت انجام دے سکیں۔بالآخر یہ جماعت دارالمصنفین کی شکل میں منصۂ شہود پر آئی۔[1]

علامہ شبلی کے شاگردوں نے تاریخ وتحقیق، ادب وتنقید، تصوف، مذہب، فلسفہ، سیرت، علم الکلام، رجال اور فقہ وغیرہ موضوعات پر متعدد کتابیں تیار اور شائع کر کے اس ادارے کے علمی وادبی وقار کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس ادارے نے علم وادب کے مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کر کے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اعلیٰ پایہ کے عالم اور ادیب اس ادارے سے وابستہ رہے جن کی علمی وادبی خدمات قدیم وجدید کا خوبصورت مرقع ہیں۔ان میں سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جنھیں علامہ شبلی کے

---

[1] ڈاکٹر خورشید نعمانی، دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳،، جلد اول، صفحہ ۲۸

شاگردوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی کے شاگرد خاص تھے۔ وہ بیک وقت محقق، مورخ، نقاد، سوانح نگار اور ادیب وشاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں مکمل کرنے کے بعد مزید حصول تعلیم کے لیے انھوں نے کانپور، آگرہ، غازی پور اور لکھنؤ وغیرہ شہروں کا سفر کیا مگر لکھنؤ کو چھوڑ کر انھوں نے کہیں بھی براہ راست تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ ذاتی مطالعے کے ذریعے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے۔ ان شہروں میں قیام کے دوران انھوں نے عربی وفارسی زبان وادب کی اعلا پایہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۶ میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ یہاں پہلی بار ان کی ملاقات علامہ شبلی سے ہوئی۔ اسی سال مولانا کا ایک مضمون ''تناسخ'' کے عنوان سے رسالہ الندوہ میں شائع ہوا جسے علامہ شبلی نے بہت پسند کیا اور مولانا کی قابلیت وصلاحیت کی تعریف کرتے ہوئے یہ پیشن گوئی کی کہ ''آگے چل کر مولانا علم وادب کے اعلی پایہ کے ادیب ثابت ہوں گے''۔ تقریباً چار سال تک مولانا رسالہ ''الندوہ'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ الندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد اعظم گڑھ واپس آگئے اور علامہ شبلی کی مایہ ناز تصنیف ''سیرت النبیؐ'' کو مکمل کرنے میں ہاتھ بٹانے لگے۔ علامہ شبلی کی حیات میں ہی مولانا کلکتہ چلے گئے جہاں وہ مولانا آزاد کے مشہور زمانہ اخبار ''الہلال'' میں معاون مدیر کے عہدے پر فائز رہے۔ برطانوی حکومت کے ذریعے اخبار پر پابندی کے بعد عبدالسلام ندوی، ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۴ میں علامہ شبلی کی وفات کے تین روز بعد اعظم گڑھ واپس آگئے۔ اور مولانا مستقل طور پر ایک رکن کی حیثیت سے دارالمصنفین سے وابستہ ہو گئے اور ۴۳؍ سال تک یعنی اپنی وفات ۴؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک اس ادارے کے ذریعے علم وادب کی خدمت کرتے رہے اور علامہ شبلی کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمن کے اس اقتباس سے مولانا کی علمی وادبی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> حضرت سید صاحب اور مولوی عبدالسلام ندوی اس ادارے کے افق پر علمی حیثیت سے مہر وماہ بن کر چمکے۔ دونوں علامہ شبلی کے علمی جمال اور ادبی کمال کے مظہر تھے، دونوں نے مل کر اپنے استاد کے مشن کی تکمیل کی۔ دونوں میں سے کس نے زیادہ لکھا، اس کا فیصلہ صفحات کی گنتی کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے مگر علمی اشتراک ویکجہتی کے باوجود دونوں میں بڑا فرق رہا۔ ایک صرف علم کے لیے تھا دوسرا علم خود تھا۔ ایک کے یہاں غیر معمولی محنت وریاضت تھی، دوسرے کے یہاں کچھ قدرت کا عطیہ تھا۔ ایک کے سامنے علمی دنیا جھکتی رہی، دوسرا علمی دنیا سے منھ موڑتا رہا۔ ایک نے

رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے میں اپنے علم کے وقار کو قائم رکھا، دوسرا ہر چیز سے بے نیاز مستغنی اور اپنی دنیا بالکل الگ بنا کر مست و سرشار رہا۔[۲]

عبدالسلام ندوی کی شہرت کی بنیاد ان کی نثری کاوشیں بالخصوص ادبی اور مذہبی تصانیف اور ترجمے ہیں، جس میں انقلاب الامم ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، اسوہ صحابہ ،اسوہ صحابیات ،ابن یمین ،فطرت نسواں، فقرائے اسلام ،اقبال کامل، ابن خلدون، امام رازی اور شعرالہند وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے، اس کے علاوہ مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست میں تاریخ اخلاق اسلامی، شعرالعرب، ہندوستان کی تمدنی تاریخ، دلائل الفرقان اور اعجاز القرآن وغیرہ شامل ہیں جو آج تک کسی وجہ سے شائع نہیں ہو سکیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی بلا کے ذہین تھے۔ ان کو زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ مکتب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے بہنوئی محبوب الرّحمن کلیمؔ کے ساتھ کانپور چلے گئے۔ کلیمؔ بذات خود شاعر تھے اور شہر میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سناتے تھے۔ مولانا کے شب و روز انھیں کی صحبت میں گزرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مولانا بھی شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے اور بعد میں شمیمؔ کے تخلص کے ساتھ باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ ابتدائی دور کی شاعری میں مولانا اپنے بہنوئی کلیمؔ سے ہی اپنی غزلوں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ قیام کانپور کے دوران انھوں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ کلیمؔ آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آگرہ روانہ ہوئے تو مولانا بھی ان کے ہمراہ ہو لیے۔ آگرہ قدیم شاعری کا مرکز تھا مگر اب وہ رونقیں باقی نہیں رہیں تھیں پھر بھی آگرہ میں اس وقت اردو زبان و ادب کے کچھ بڑے شعرا شاعری کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے جس میں خادم حسین رئیسؔ، بزرگ علی عالیؔ اور واصف علی واصفؔ وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی محفلوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور شہر میں ان کے نام کا غلغلہ تھا۔ کلیمؔ بھی ان شعرا کی محفلوں میں شامل ہونے لگے اور آگرہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنانے لگے۔ کلیمؔ کے توسط سے مولانا کو بھی ان شعرا کے قریب آنے کا موقع میسر ہوا اور یہ شعرا مولانا کے شعری کمال سے متعارف ہوئے۔ اس ماحول میں مولانا کا شعری ذوق تیزی سے پروان چڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا آگرہ کے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے اور یہاں کے کئی مشاعروں میں اپنا کلام سنایا۔ ابتدائی دور کی اس شاعری میں مولانا کے قلم سے بعض اشعار

---

[۲] سید صباح الدین عبدالرحمن، معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۲

ایسے نکلے جس نے اس دور کے شعرا کو بے حد متاثر کیا اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ مرزا خادم حسین رئیسؔ نے مولانا کے اس شعر پر بہت داد دی :

میں مر گیا ہوں کسی غیرت چمن کے لیے
کہ لائیں چادرِ گل بلبلیں کفن کے لیے

آگرہ ہی میں مولانا کے اس شعر کی بڑی چرچا رہی جسے لوگوں نے بہت پسند کیا:

چار سو مجھ کو شب و روز لیے پھرتی ہے
ایک ہنڈولا اسے کہئے میری وحشت کیسی

مولانا کا ایک اور شعر دیکھیے:

خود بھیک کے دینے کو در پر وہ نکل آئیں
اے حضرت دل درد بھری ایسی صدا ہو

آگرہ میں قیام کے دو سال بعد مولانا غازی پور چلے آئے جہاں مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ اس مدرسے کے ناظم عبدالاحد شمشاد کا شمار اس دور کے اعلا پایہ کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ غازی پور کے بیشتر نوجوان شعرا آپ سے ہی اپنی غزلوں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ قیام غازی پور کے دوران مولانا بھی اپنی غزلوں پر انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ مولانا کے اس شعر پر عبدالاحد شمشاد نے جی کھول کر داد دی:

بدگمانی سے انھیں میری نظروہ سمجھے
چمکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

غازی پور میں وبا پھیلنے کے بعد مولانا نے لکھنؤ کا رخ کیا اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہو گئے جہاں ندوہ کے کچھ طلبہ شاعری میں زور آزمائی کر رہے تھے جن میں مولوی عبدالغفور، حکیم رکن الدین داناؔ اور سید سلیمان ندوی وغیرہ شامل تھے جو دارالعلوم ندوہ میں وقتاً فوقتاً مشاعرے منعقد کر کے اپنا کلام سناتے تھے۔ مولانا بھی ان مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی غزلیں پڑھنے لگے۔ دوسری طرف اس وقت لکھنؤ میں بھی شعر و شاعری کا ماحول گرم تھا۔ حالانکہ مولانا لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے مگر اس دور میں ان کی کئی غزلیں امیر مینائی کے رسالے ''دامن گلچیں'' میں شائع ہوتی رہیں۔ اس وقت لکھنؤ میں ضامن علی جلالؔ اور امیر مینائی کی شاعری کی شہرت تھی جن کے کلام سے مولانا فیض یاب ہوتے رہے۔ بالخصوص ضامن علی جلالؔ کی شاعری نے ان پر دور رس اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔

مولانا نے کئی بار جلالؔ لکھنوی سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکے کیو نکہ جلالؔ لکھنوی بغیر معاوضے کے کسی کے کلام کی اصلاح نہیں کرتے تھے اس لیے جلالؔ لکھنوی نے مولانا کے کلام پر کبھی نظر ثانی نہیں کی۔ مگر مولانا کو تاحیات جلالؔ لکھنوی سے عقیدت رہی اور خاص کر ''شعر الہند'' کی تالیف کے دوران یہ قربت مزید بڑھ گئی۔

الندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا نے لکھنؤ کو خیر آباد کہا اور اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آگئے جہاں انھیں علامہ شبلی جیسے عالم کی صحبت نصیب ہوئی۔ علامہ شبلی اردو اور فارسی کے اعلا پایہ کے شاعر تھے اس لیے ان کی محفلوں میں شاعری پر ناقدانہ حیثیت سے بحث و مباحثہ کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اس وقت علامہ شبلی فارسی شاعری کی تاریخ ''شعر العجم'' کے نام سے مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے لیے بھی مواد جمع کر چکے تھے۔ مولانا کو علامہ شبلی کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔ چند ایام علامہ شبلی کی سایۂ تربیت میں گزارنے کے بعد مولانا کلکتہ روانہ ہو گئے اور مولانا آزاد کے اخبار ''الہلال'' کی اشاعت میں تعاون کرنے لگے۔ یہاں بھی شعر و شاعری سے مولانا کی دلچسپی کم نہیں ہوئی بلکہ کلکتہ میں قیام کے دوران انھوں نے شہر میں منعقد ہونے والے بیشتر مشاعروں میں اپنا کلام سنایا اور داد و تحسین حاصل کی۔ رضا علی وحشتؔ نے جو ادبی دنیا میں وحشتؔ کلکتوی کے نام سے مشہور ہوئے، مولانا کے اس شعر کی بہت تعریف کی:

ازل سے خشک و تر کی بحر و بر کی جب ہوئی قسمت

مزاج خشک زاہد کو ملا دامان تر ہم کو

علامہ شبلی کی وفات کے تین روز بعد مولانا کلکتہ سے اعظم گڑھ واپس آگئے اور دار المصنفین کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ وہ تاحیات اس ادارے کی خدمت پر مامور رہے اور تقریباً ۴۳ سال تک علم و ادب، دین و مذہب، قوم و ملت، فلسفہ اور شاعری کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ جس وقت مولانا اعظم گڑھ میں قیام پذیر تھے یہاں بھی ادبی مجلسوں اور مشاعروں کا رواج زور پکڑتا جا رہا تھا۔ اسی دور میں جگرؔ مراد آبادی بھی تاجر کی حیثیت سے اعظم گڑھ آتے اور مرزا احسان بیگ کے مکان پر قیام کرتے تھے۔ دوسری طرف اقبال احمد سہیلؔ بھی وکالت کرنے کی غرض سے اعظم گڑھ شہر میں ہی قیام کرنے لگے۔ اس طرح شہر میں ادبی مجلسوں اور مشاعروں کا رواج عام ہو گیا شہر اور اطراف میں مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ مولانا بھی ان مجلسوں اور مشاعروں میں جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ اس دوران کئی مشاعروں کی صدارت کی اور اپنا کلام بھی

سنایا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے اس شعری سفر نامے کے اس مختصر جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی ایک ایسے ماحول میں بسر ہوئی جہاں شعر و شاعری کا غلبہ تھا۔ وہ بڑے بڑے شعرا و اساتذہ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا شاعری میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں دور جدید کے شعرا کا کلام عوام میں بے حد مقبول تھا جس کی وجہ سے مولانا کے کلام پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ مولانا کا کلام دور جدید کے شعرا کے کلام سے مختلف تھا۔ انھوں نے دور جدید کے شعرا کی روش کبھی اختیار نہیں کی، اور نہ ہی کبھی ان کے کلام کو پسند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کا کلام جدید رنگ سے عاری ہے۔ یہی نہیں بلکہ امیر مینائی اور شمشاد کی شاگردی اور جلال لکھنوی سے عقیدت کی وجہ سے وہ لکھنوی شعرا کے متبع سمجھے جاتے رہے جبکہ اس دور میں لکھنوی شاعری کے رنگ کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا کوئی مجموعہ کلام آج تک دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے ان کی شاعری پر کوئی مستقل رائے قائم کرنا یا ان کی شاعری پر کوئی حتمی فیصلہ صادر کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ البتہ شاہ معین الدین ندوی اور کبیر احمد جائسی نے مولانا کی بیاض کا ذکر ضرور کیا ہے جو بہت دنوں تک دارالمصنفین کے کتب خانے میں محفوظ رہی مگر بعد میں وہاں سے غائب ہوگئی۔ وہ آج تک حاصل نہیں کی جا سکی اور ان کی بیاض کے غائب ہونے کا واقعہ آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔ اس وقت مولانا کی وہی غزلیں اور اشعار دستیاب ہیں جسے شاہ معین الدین ندوی اور کبیر احمد جائسی نے ان کی حیات میں ہی محفوظ کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں ان کی وہ غزلیں جو رسالہ ''دامن گلچیں'' اور رسالہ ''معارف'' میں شائع ہوئیں وہ بھی آج دستیاب ہیں۔ یہی ان کا مختصر سا شعری سرمایہ ہے جو تقریباً ۳۰۔۳۵ غزلوں اور اشعار پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ مولانا نے کچھ غزلیں فارسی زبان میں بھی کہی تھیں جن پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مولانا کے اس مختصر سے کلام کو سامنے رکھ کر ان کی شاعری کی مکمل طور سے وضاحت نہیں کی جا سکتی اور اس کی بنیاد پر یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا کی شاعری کا اصل رنگ کیا تھا۔ البتہ کچھ حد تک یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے جلال لکھنوی کی معتدل روش کو اختیار کیا۔ مولانا اس بات کے ضرور قائل ہیں کہ دور جدید کے شعرا کے یہاں بھی عمدہ کلام کی کمی نہیں مگر ان کی شاعری میں تغزل کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے جو کہ شاعری کی روح ہے۔ اسی لیے انھوں نے جلال لکھنوی کی شاعری کی پیروی شروع کر دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ دہلوی شعرا کی پیروی کرتے تھے اور نہ ہی لکھنوی شعرا کی

بلکہ وہ پاکیزہ، متین اور سنجیدہ شاعری کے قائل تھے۔

مولانا کی دستیاب غزلوں اور اشعار کی بنیاد پر ان کی شاعری کی چند نمایاں خصوصیات مختصراً اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں: ان کی شاعری میں پاکیزگی ہے، عریانی اور فحاشی سے ان کی شاعری کا دامن پاک ہے۔ انھوں نے جس دور میں شاعری شروع کی تھی وہ دور جدید کے شعرا کے عروج کا زمانہ تھا مگر انھوں نے اپنی شاعری میں قدیم شاعری کی صالح روایات کو شامل کر کے اپنی شاعری کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے پرانی روایات سے کبھی منھ نہیں موڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تغزل، موسیقیت، رمز وایمائیت اور غنائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں شوخی و چھیڑ چھاڑ نہیں بلکہ ان کی شاعری پر داغؔ و مصحفیؔ کا رنگ غالب نظر آتا ہے انھوں نے اپنی شاعری میں انھیں کی تقلید اور پیروی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چونکہ انھوں نے عربی زبان وادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کی شاعری میں عربی شاعری کی خصوصیات بھی شامل ہو گئی ہیں۔ بقول ارشد کیانی:

> ان کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ ساتھ ایک مرکزی موڑ ملتا ہے جو غزل کے ہر شعر کو وحدت تاثر کے رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ غنائیت اور نغمگی کا رکھ رکھاؤ ان کے یہاں ایک حد تک موجود ہے۔ ایمائیت، اشاریت اور تلمیحات ان کی غزل میں عام ملتا ہے۔۔۔ ترکیبیں مولانا نے بڑی فراخ دلی سے استعمال کی ہیں۔[۳]

ان کے اشعار کا نمونہ دیکھیں:

یہیں سے ہوش کھو کر اس طرف اے نامہ بر جانا — خبر کو یار کی جاناتو ہو کر بے خبر جانا

ابھی مرتا ہوں میں بس ایک ہی لمحہ ٹھہر جانا — اثر اپنی دوا کا دیکھ کر اے چارہ گر جانا

ان کی غزل کا ایک شعر اور دیکھئے جس سے مولانا کے رنگ سخن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

نشہ میں ہیں کبھی تو کبھی ہیں خمار میں — اچھی گزر رہی ہے شب انتظار میں

گزرے گا روز حشر بھی اب انتظار میں — شامل ہے یہ بھی وعدۂ فردائے یار میں

ان کی شاعری کے اس مختصر جائزے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کو شاعری کے فن پر گہری

---

[۳] گلشن طارق، عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۱۴، صفحہ ۱۰۹۔۱۱۰

دسترس تھی اور اس کے رموز و نکات سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اچھے شعر کی خوبیوں و خامیوں کی انھیں پہچان تھی اور الفاظ کے مناسب استعمال پر انھیں گہری دسترس تھی مگر ان کی پوری شاعری دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے تشنگی کا احساس شدت سے باقی رہتا ہے۔ چونکہ ان کی شاعری بہت مختصر ہے اس لیے ان کی شاعری سے ان کے شعری نظریات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن ''شعر الہند'' میں انہوں نے اچھے شعر کی خوبیوں اور خامیوں پر جس طرح سے بحث کی ہے اس سے ان کے شعری نظریات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے شعری نظریات پر عربی شاعری کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ بالخصوص قدامہ ابن جعفر اور ابن رشیق کے شعری و تنقیدی نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کسی معاشرے اور تہذیب و تمدن کے اصلی چہرے کو دیکھنا ہو تو اس قوم کی شاعری کا مطالعہ کے بجائے اس کے کلام کے فنی محاسن کو دیکھنا چاہئے۔ وہ قدیم طرز کی شاعری کے دلدادہ اور پیرو کار تھے اور قدیم شاعری کی صالح روایات سے استفادہ کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ شاعر کو داخلی کیفیات اور قلبی واردات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری گوشۂ تنہائی کی چیز ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ دنیا سے بے نیاز ہو کر بھی شاعری کی جاسکتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شاعری کو تمام خارجی حالات سے علیحدہ سمجھتے ہیں بلکہ وہ بھی اپنے استاد علامہ شبلی کی طرح شاعر کی آزادی پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعر کو آزاد فضا میں سانس لینا چاہیے، اس پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کی شاعری میں قلبی واردات کا عکس واضح طور سے دیکھا جاسکے گا کیونکہ وہ شاعری کو قلبی واردات کے بیان کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

عبدالسلام ندوی عاشقانہ شاعری کے لیے اوصاف حمیدہ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک عام قول ہے کہ عاشقانہ شاعری کے لیے اوباش اور رند کی ضرورت ہوتی ہے۔ عبدالسلام ندوی اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عام خیال ہے کہ عاشقانہ شاعری کے لیے محاسنِ اخلاق سے زیادہ رندوں اور اوباشوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عاشقانہ سے زیادہ کوئی چیز اوصافِ حمیدہ کی محتاج نہیں۔ قناعت، خودداری، بلند حوصلگی، فراخ مشربی، آزادی اور پاکیزگی، غرض وہ تمام اوصاف جو ایک صوفی منش

شخص کے لیے درکار ہیں، عاشقانہ شاعری کا عنصر ہیں اور انھیں سے لطیف جذبات اور بلند خیالات پیدا ہوتے ہیں جو عاشقانہ شاعری کا آب و رنگ ہیں۔[۴]

وہ درباری شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شاعر اپنا رشتہ دربار سے جوڑتا ہے اس کی شاعری میں کبھی بلندی پیدا نہیں ہوسکتی اور اس کی شاعری کا دامن درد و اثر اور سوز و گداز سے خالی رہتا ہے۔ غزل کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ غزل صرف قوت منفعلہ کے مظاہرے کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ غزل میں انھیں خیالات واحساسات کو پیش کیا جانا چاہیے جو تمام عاشقوں میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہوں اور سبھی کے ساتھ پیش آنے والے ہوں۔ معشوق کے جسمانی اوصاف کی تعریف غزل کی حقیقت سے خارج ہے۔ جو شعرا اپنی غزلوں میں اس طرح کے مضامین بیان کرتے ہیں وہ اعلا پایہ کے شاعر نہیں کہے جاسکتے۔ غزل کے الفاظ شیریں، نرم، خوشگوار اور واضح ہونے چاہئیں۔ غزل کا طرز ادا بھی نہایت طرب انگیز، مستانہ اور متانت شکن ہونا چاہیے۔ غزل میں شاعرانہ تعلّی سے گریز کرنا چاہیے اور اپنی عظمت کو بیان نہیں کرنا چاہیے۔ معشوق کو غیرت مند ہونا چاہیے اس لیے اس قسم کے اشعار جن سے یہ ثابت ہو کہ معشوق ہرجائی اور بازاری ہے، اصولِ تغزل کے خلاف ہے۔ معشوق کا ادب و احترام بھی غزل کا لازمی جز ہے اور غزل میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کہنا چاہیے جو معشوق کے شایان شان نہ ہو۔

وہ عشقیہ جذبات و احساسات کو غزل کا اہم عنصر تسلیم کرتے ہیں اور شاعری میں عشق و عاشقی، وارفتگی اور یاس و محرومی کے مضامین کو پیش کرنا معیوب نہیں سمجھتے بلکہ وہ عشق میں ناکامی کو تغزل کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور عشق میں کامیابی کو ہوس ناکی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں متصوفانہ اشعار کی پیش کش کو ایک حد تک قبول کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں مبالغہ آرائی کے خلاف ہیں اور شاعر کو اس بات کی تنبیہ کرتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے شاعری میں مبالغہ آرائی سے گریز کرے کیونکہ اس سے شاعری کا فن مجروح ہوتا ہے۔ شاعری میں عجز و انکساری، سوز و گداز، رندی و سرمستی، عشق و طرب کے مضامین کو خوبصورت انداز میں فنی چابکدستی سے پیش کرنا چاہیے۔ محبوب کے اوصاف کو بیان کرتے وقت اخلاقیات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ محبوب کے جسمانی اوصاف کے بیان میں توازن سے کام لینا چاہیے، اس کے ادب و احترام کا خیال کرتے ہوئے اس کے جسمانی اوصاف کو مناسب

---

[۴] عبدالسلام ندوی، شعر الہند، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ایڈیشن چہارم، ۱۹۴۹، جلد اول، صفحہ ۷۱

طریقے سے پیش کرنا چاہیے۔ جسمانی اوصاف کو بیان کرنا کسی حد تک جائز ہے مگر ساری توجہ اسی پر صرف کر دینا شاعری کے معیار کو گرا دیتا ہے۔ عام طور سے غزلوں میں رنج و غم، سوز و گداز کے مضامین پیش کیے جاتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ غزل میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو پر اثر، نرم و نازک، شیریں و لطیف ہوں اور طبیعت پر خوشگوار اثر قائم کریں۔ خمریات کے بیان میں فنی مہارت سے کام لینا چاہیے۔ اخلاقیات کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور نامناسب الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ غور و فکر کے بعد خمریات کے مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے اور اپنے خیالات کو شوخی و ظرافت کی حد تک محدود رکھنا چاہیے۔ غزل میں ایسی بحور کا انتخاب کرنا چاہیے جو موضوع کے مناسب ہوں اور حسن و خوبی کے ساتھ مضامین کو ادا کر سکیں۔

اس طرح عبدالسلام ندوی کی شاعری اور ان کے نظریۂ شعر کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو شاعری کے فن پر گہری دسترس تھی اور شاعری میں ان کو برتنے کا سلیقہ انھیں آتا ہے۔ شاعری کے متعلق ان کا نظریہ بالکل واضح ہے۔ وہ تصنع اور مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں اور داخلیت اور حقیقت پسندی پر زور دیتے ہیں۔ چونکہ ان کی پوری شاعری دستیاب نہیں ہے اس لیے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ان چیزوں کو کس حد تک پیش کیا ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انھیں شاعری کے فن پر کمال حاصل تھا اور مذکورہ بالا تمام خوبیاں ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں جو شاعری کے معیار حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔

بیسویں صدی کی فارسی شاعری میں نئے ادبی رجحانات

ڈاکٹر یاور عباس میر

اسسٹنٹ پروفیسر فارسی، پنجابی یونیورسٹی، مالیر کوٹلہ پنجاب

miryawarabass@gmail.com

بیسویں صدی عیسوی تاریخِ عالم میں ایک انقلابی صدی شمار ہوتی ہے۔اس صدی میں ما قبل صدیوں کے بہ نسبت انسانی زندگی کے تقریباً تمام شعبہ جات میں کافی تبدل و تحول نظر آتا ہے۔ خواہ وہ سائنسی میدان ہو یا سیاسی، علم و ادب کی زمیں ہو یا فنکاری کا آسماں، تجارت کی دنیا ہو یا ٹرانسپورٹ کا جہاں، غرض ہر شعبہ میں حیرت انگیز پیشرفت اور تبدلیاں نظر آتی ہیں۔جب انسانی سماج اور تہذیب و فرہنگ میں انقلاب آتا ہے تو شعبۂ ادب بھی اپنے اندر تحول پیدا کر لیتا ہے۔ فارسی ادب پر بھی بیسویں صدی نے اپنے اثرات مرتب کئے اور نئے ادبی رجحانات وجود میں آئے۔ نظم و نثر دونوں میں کافی تبدیلی اور جدت رونما ہوئی۔ منظوم ادب کی ہیئت میں جو تبدیلی نظر آتی ہے ان میں 'شعر موجِ نو'، 'شعر سپید' اور 'شعر نیمائی' وغیرہ شامل ہے اور موضوع کے اعتبار سے سیاسی و انقلابی شاعری، حماسی شاعری، آئینی شاعری وغیرہ جیسے جدید ادبی رجحانات وجود میں آئے۔ اسی طرح منثور ادب میں بھی داستان، ناول اور ڈرامہ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔البتہ اس مقالے میں ہم صرف منظوم ادب کے رجحانات کو ہی زیر بحث لائے ہیں۔فارسی زبان و ادب کا منبع ایران ہے اور آج بھی دنیائے فارسی میں ایران کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لہذا ہم نے فارسی ادب میں نئے رجحانات کا تعین کرنے کے لئے بیسویں صدی کے ایران کو ملحوظِ نظر رکھ کر ہی جائزہ لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ بیسویں صدی ایک انقلابی صدی گزری ہے، اس کے اندر تقریباً زندگی کے ہر شعبے میں پیشرفت اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ جب ہم فارسی زبان و ادب کی بات کرتے ہیں تو ایران کا تصور ہمارے ذہن میں ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ایران کے اندر اس صدی میں مسلسل سیاسی رسہ کشی جاری رہی ہے۔اور ظاہر ہے کہ سیاسی ناہمواری کے اثرات سماج و قوم پر لازمی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ چونکہ شعر و ادب سماج و قوم کا آئینہ دار اور ترجمان ہوتا ہے تو یہ ادبی شعبہ ایسے حالات میں متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ پاتا۔ چنانچہ اس صدی میں ایران کے اندر رونما ہونے والے بڑے واقعات میں ایک

''تحریکِ مشروطیت''(۱۹۰۶ء) ہے جس کی وجہ سے فارسی ادب کے رجحان میں کافی تبدیلی آئی۔اس تحریک نے شعرا و قلم کاروں کے لئے میدان وسیع کر دیا۔اب شعر و شاعری محبوب کی زلفوں، بادشاہ کے محلوں، عشقیہ داستانوں، جام و ساغروں وغیرہ جیسے قدیم اور تکراری موضوعات کے قید و بند سے باہر آکر آزاد فضا میں سانس لینے لگی۔اہل قلم اب انقلاب، آزادی، تعلیم، حقوق طلبی، ظلم ستیزی وغیرہ جیسے موضوعات کے لئے بھی خامہ فرسائی کرنے لگے۔اس سے قبل فارسی شاعری میں احساسِ دروں، اخلاق، عشق و عرفان، عشقیہ داستان، بادشاہوں کی مدحت سرائی وغیرہ جیسے موضوعات ہی زیر نظر ہوا کرتے تھے۔لیکن مشروطیت کی تحریک کے بعد فارسی شاعری میں انقلاب برپا ہوا۔ البتہ اس ادبی انقلاب کے پیچھے صرف تحریکِ مشروطیت کو ہی سببِ اصلی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ مشروطیت کے علاوہ چند دیگر محرکات بھی کارفرما تھے، جن میں سے چند اہم اسباب درج ذیل ہیں:

- ایرانی طلبا کا یورپی ممالک کی طرف سفر اور مغربی زبان و فرہنگ سے آشنائی۔
- یورپی ادب کی فارسی میں ترجمانی۔
- ایران میں چاپ خانہ کی شروعات اور کتابوں کی اشاعت۔
- دارالفنون کی بنیاد۔
- روزناموں کی شروعات جیسے کاغذ اخبار، نوبہار وغیرہ

تاریخ ایران میں مشروطیت کی تحریک نے ایرانیوں کی فکری بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ تحریک مشروطیت نے مجموعی طور پر دو طریقوں سے اپنا اثر ظاہر کیا۔ایک یہ کہ پڑھائی لکھائی (جو اس زمانے تک صرف امراء طبقہ تک ہی محدود تھی) عام ہو گئی، مدرسوں کی تعمیر و ترقی میں وسعت پیدا ہوئی، مختلف قسم کے اخبارات، رسائل اور جرائد نے لوگوں کو سیاسی و سماجی مسائل سے آشنا کرایا اور یہی آشنائی نئے ادب کے وجود کا ایک سبب بنی۔دوسرا یہ کہ یورپی ممالک کے لوگوں سے ایرانیوں کے روابط بڑھ گئے اور یورپی افکار سے آشنائی نے ایرانیوں میں آزادی خواہی، وطن پرستی، تعصب ملی، انتقاداتِ سیاسی و سماجی کو جنم دیا جو ادبیات میں شامل ہو کر شعر و ادب کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

تحریک مشروطیت کے بعد بھی شعرا و مصنفین کا ادبی رجحان تبدیل ہونے کی ایک بڑی وجہ قاچاری اور پہلوی حکمرانوں کا ظلم و استبداد ہے جس نے بہت ساری جگہوں پہ تحریک آزادی کو جنم دیا اور قلم کاروں نے ان تحریکوں میں اپنی تخلیقانہ صلاحیتوں سے روح پھونک دی اور ہر طرف احتجاجی مظاہروں میں انقلابی اشعار پڑھے جانے لگے جس سے دیگر شعرا بھی متاثر ہو کر اس طرف توجہ دینے لگے۔

۱۹۲۰ء کے بعد کا زمانہ ایران میں ادبی تحول کے اعتبار سے اہم ہے۔ آغاز مشروطیت یعنی ۱۹۰۶ء سے لے کر انقلابِ اسلامی کے بعد تک مجموعی طور پر ہمیں ایران میں تین طرح کے شعری اسلوب دکھائی دیتے ہیں:

پہلا وہی کلاسیکی اسلوب ہے جس میں روایتی انداز میں متقدمین کی پیروی میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ لکھنے کا رواج ہے۔

دوسرا اسلوب قدیم وجدید طرز کو ایک دوسرے میں ضم کر کے تشکیل پاتا ہے۔ اگرچہ اس اسلوب کے شعرا جدید افکار کو قدیم ہیئت میں بیان کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ صرف ونحو، اوزان و قوافی اور معانی وبیان کی قدیم روایت کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

تیسرا اسلوب کلاسیکی ادب سے بالکل الگ ہے۔ اس اسلوب میں جدید افکار کے ساتھ ساتھ جدید ہیئت بھی استعمال کی جاتی ہے۔ پرانی ہیئت اور مشکل بحروں کے بجائے آسان اور طرب انگیز بحروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ قاچاری دور کے بعد شعری ادب زیادہ شائع ہونے لگا تھا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے لگا تھا اسی لئے اکثر شعرا نے یہ بھانپ لیا تھا کہ شعر کی زبان بھی سادہ اور عام فہم ہونی چاہئے۔[1]

بیسویں صدی میں ایران کے اندر کئی اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے ایران میں وقتاً فوقتاً ایک نیا ماحول پیدا ہوتا رہا اور ادبی رجحان میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ ادبی تحول کے اعتبار سے ہم بیسویں صدی کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں : پہلا: ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۱ء تک ۔ دوسرا: ۱۹۴۱ء سے ۱۹۷۹ء تک۔ تیسرا: ۱۹۷۹ء کے بعد کا دور۔

پہلا دور یعنی آغاز مشروطیت ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۱ء تک

یہ ایرانی تاریخ میں ایسا دور ہے جب شاہی حکومت میں مجلس شوریٰ کے ذریعہ سے لوگوں کا بھی عمل دخل شامل ہوا اور بادشاہ کی مطلق العنانی کسی حد تک کم ہوئی۔ اس دور میں لکھنے والوں کا زیادہ تر رجحان حکومت اور حکومتی اداروں پر تنقید کی طرف رہا، عورتوں کی پسماندگی اور ان کے حقوق کا تذکرہ بھی اہل قلم کے موضوعات میں شامل رہا۔ مجموعی طور پر زیادہ تر شاعری سیاسی وسماجی لباس زیب تن کئے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر ظہور الدین احمد، نیا ایرانی ادب، ضیائے ادب، لاہور، ۱۹۹۰، ص: ۲۷۔۳۰

نظر آتی ہے۔سیاسی شاعری کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے مضامین کی طرف شعرا کا میلان دکھائی دیتا ہے، جن میں سے چند ایک موضوعات یہ ہیں :

شعر آزادی و سیاسی

اس موضوع کے اندر ایران اور دنیا کے سیاسی و تاریخی انقلابات و حوادثات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جنگ و صلح، تاریخی معاہدے، سیاسی تحریکیں ، زوالِ حکومت اور قتل حکمران و تشکیل حکومت وغیرہ۔ دور مشروطیت اور اس کے بعد یہ آزادی کا موضوع تقریباً پورے ایران میں زیر بحث رہا ہے۔اس موضوع کے تحت شعرا نے قانون خواہی، آزادی طلبی، ظلم ستیزی، آزادیٔ قلم و بیاں وغیرہ پر خوب اشعار لکھے ہیں۔ ادیب الممالک، بہار مشہدی، عشقی، فرخی یزدی، عارف قزوینی وغیرہ نے اس موضوع پر کثرت سے اشعار لکھے ہیں۔اس کے علاوہ آزادیٔ زن و حقوقِ زنان کے موضوع پر لکھنے والے مشہور شعرا میں سے نسیم شمال، علی اکبر دہخدا، لاہوتی، ایرج مرزا، پروین اعتصامی وغیرہ کا کلام بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

عارف قزوینی:

پیام دوشم از پیر می فروش آمد — بنوش باده که یک ملتی به هوش آمد
زار پرده از ایران درید استبداد — هزار شکر که مشروطه پرده پوش آمد
زخاک پاک شهیدان راه آزادی — ببین که خون سیاوش چنان به جوش آمد[۲]

فرخی یزدی

آن زمان که بنهادم سر به پای آزادی — دست خود ز جان زشتم از برای آزادی
تا مگر به دست آرم دامن وصالش را — می دوم به پای سر در قفای آزادی[۳]

بہار مشہدی

با، شہِ ایران ز آزادی سخن گفتن خطاست — کار ایران با خداست
مذهب شاهنشه ایران ز مذهب ها جداست — کار ایران با خداست[۴]

---

[۲] محمد علی، شہر شعر عارف، نشر علم، تہران، ۱۹۹۶ء، ص ۴۵

[۳] فرخی یزدی، دیوان، تصحیح: حسین مکی، بنیاد نشر کتاب، ایران، ۱۹۷۸ء ص ۱۷۷

[۴] محمد تقی بہار، دیوان اشعار، چاپ خانہ سپہر، تہران، ۱۹۷۵ء، ج ا، چاپ ۳، ص ۱۴۶

آزادیٔ زنان و مسئلۂ حجاب

بہار مشہدی

جوان بخت و جهان آرایی ای زن — جمال وزینت دنیایی ای زن
صدف خانہ است و صاحب خانہ غواص — تو در وی گوهر یکتایی ای زن[۵]

میرزادہ عشقی

چیست این چادر وروبنده نازیبنده — گر کفن نیست پس بگو چیست این روبنده[۶]

ایرج مرزا

فقیہ شهر بہ رفع حجاب مائل نیست — چرا کہ هر چہ کند حیلہ در حجاب کند[۷]

وطن دوستی

وطن پرستی ایرانیوں کی رگ رگ میں بسی ہے۔اس دور میں بھی وطن پرستی کے جذبات کا اظہار بڑے جوش و خروش اور محبت و اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں ادیب الممالک، طالبوف، ادیب پشاوری، فروغی، عشقی، دانش مشہدی وغیرہ کی نظموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔چند اشعار بطور نمونہ :

میرزا عشقی

خاکم بہ سر ز غصہ بہ سر خاک اگر کنم — خاک وطن رفت چہ خاکی بہ سر کنم[۸]

بہار مشہدی

ای خطۂ ایران مهین ای وطن من — ای گشتہ بہ مهر تو عجین جان و تن من[۹]

نسیم شمال

گردیده وطن غرقۂ اندوه و محن، وای — ای وای وطن وای
خیزید و روید از پی تابوت وکفن وای — ای وای وطن وای
از خون جوانان کہ شده کشتہ در این راه — رنگین طبق ماه

---

[۵] ماخذ سابق، ص ۶۴۴

[۶] گنجور آنلائن:https://ganjoor.net/eshghi/namayesh/ksiyah/sh10

[۷] ایرج مرزا، قصائد، انتقاد از حجاب، بحوالہ گنجور انلائن:https://ganjoor.net/iraj/ghaside/sh10

[۸] میرزادہ عشقی، دیوان اشعار، عشق وطن، بحوالہ گنجور آنلائن:https://ganjoor.net/eshghi/divan/gh/sh28

[۹] محمد تقی بہار، دیوان اشعا، چاپ خانہ سپہر، تہران، ۱۹۷۵ء، ج ۱، چاپ ۳، ص ۲۱۶

خونین شدہ صحرا و تل و دشت و دمن وای ای وای وطن وای[10]

انتقادی اشعار

تنقیدی اشعار کہنے میں مشہور علی اکبر دھخدا، ادیب الممالک، وحید دستگردی، غلام رضا، اشرف گیلانی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ انہوں نے سرکار اور سرکاری اداروں کے علاوہ ریاکار ملاؤں اور سماجی خرابیوں پر بھی تنقید کی ہیں۔

سرمایہ دار، مزدور اور سوشلزم پر اشعار

لاہوتی، رعدی، پروین گنا آبادی، علی اشرف دبیر، عشقی، کاظم رجوی کے نام اس ضمن میں لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع کی طرف نسبتاً زیادہ میلان ظاہر کیا ہے۔

توصیفی اشعار

وحید دستگردی، رشید یاسمی، بہار مشہدی وغیرہ جیسے شعرا نے اس موضوع پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔

اخلاقی اشعار

سماج کی بری عادات ورسومات کی مخالفت اور اچھی عادات وبلند اخلاق کی تبلیغ کے لیے بہت شعرا کا رجحان اس طرف رہا ہے جن میں بہار مشہدی، وحید دستگردی، ایرج مرزا، حبیب یغمائی، پروین اعتصامی، رعدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تربیتی اشعار

بچوں اور نوخیز جوانوں کی صحیح تربیت اور تعلیم کی طرف تشویق کے لئے کچھ شعرا نے قطعات وغیرہ میں اس موضوع کو بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں عبدالعظیم قریب، محیط طباطبائی، ادیب طوسی، ہدایت اور سمیعی وغیرہ کے قطعات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

---

[10] اشرف الدین، دیوان نسیم شمال، انتشارات سنایی، تہران، ۲۰۲۰ء، چاپ ۳، ص ۴۷۵

دوسرا دور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۷۹ء تک، رضا شاہ پہلوی کا دور

اس دور کو اگر آزادی طلب و آزادی پسند دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ سب سے زیادہ تاریخ ساز انقلابی جدوجہد اور آزادی طلب سرگرمیاں اسی دور میں رونما ہوئیں جو انقلاب اسلامی پر منتج ہوئیں۔ اس دور کا زیادہ تر ادب سیاسی رسّہ کشی، قتل و خونریزی، ظلم و استبداد اور آزادی خواہی سے عبارت ہے۔ شعرا نے اپنی ذاتی شخصیت کو ملت کے سمندر میں ضم کرکے پوری ملت کی ترجمانی کی۔ ظلم و استبداد کی وجہ سے لوگوں کا رجحان یاس و ناامیدی کی طرف ہونے لگا تھا لیکن شعرا نے انقلابی شاعری کے ذریعے سے پر امید ماحول بنانے کی بھرپور کوششیں کیں۔

شعرِ نو اور نیما

اسی دور میں، یعنی ۱۹۴۱ء کے بعد، فارسی شاعری کی ہیئت میں ایک بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی اور ایک نئی قسم کی شاعری کا رواج ہوا، جو ''شعر نو'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ نیما یوشیج بیسویں صدی کے بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ یہی وہ شاعر ہیں جنہوں نے ''شعر نو'' کی بنیاد رکھی اور جدید رجحانات کے لئے جدید شعری قالب وضع کئے۔ آپ کا اصل نام علی تھا، یوش طبرستان میں پیدائش کے سبب یوشیج کہلائے۔ آپ فرانسیسی ادبیات سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ جوانی میں حسب دستور آپ نے بھی عشق کی وادی میں قدم رکھا تھا لیکن عشق میں ناکامی کے سبب آپ کے دل پہ درد و کرب نے بہت اثر کیا جس نے آپ کے کلام میں عجیب سی تبدیلی بلکہ پختگی پیدا کردی۔ جنتیؔ نے لکھا ہے کہ نیما کی ایک طویل نظم ''افسانہ'' جو پانچ پانچ مصرعوں کے ۱۲۸ بندوں پر مشتمل ہے اسی پہلے عشق میں ناکامی کا نتیجہ تھی۔ اوائل میں نیما متقدمین کی پیروی کرتے تھے لیکن نظم ''افسانہ'' لکھ کر آپ نے ایک نئی راہ نکالی جو آپ کی شاعری میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرز سے بہت سے شعرا متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی اس کی پیروی شروع کی۔ مثلاً عشقیؔ کی ''سہ تابلوی مریم'' اور ''ایدآل مردِ دہقان''، شہریار کی ''ہذیانِ دل''، وغیرہ جیسی نظموں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

شعر نو: شعر کہن کے برعکس یہ ایک نئی طرز کی شاعری ہے۔ شعر کہن میں قدیم روایت کے مطابق شاعری کی جاتی ہے جبکہ شعر نو میں ردیف و قافیہ اور کلاسیکی بحور و اوزان سے رو گردانی دکھائی دیتی ہے اور جدید قالبوں اور ہیئتوں میں شاعری کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شعر نو میں نئے اور تازہ ترین مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ اس طرز کے حامیوں کا کہنا ہے کہ شعر کہن و قدیم روایتی شاعری قدیم ماحول کی

پیداوار تھی۔ ہر دور کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے اور طرح طرح کے تقاضے سامنے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے زمانے کے طرز تفکر سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، اس لحاظ سے آج کا زمانہ پرانے مدحیہ قصائد، افسانوی مثنویوں اور لمبی لمبی عشقیہ داستانوں کا متقاضی نہیں ہے۔ مشکل اور سخت قسم کے ردیف و قوافی قارئین کے لئے مشکل پیدا کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آج کی شاعری میں یہ سب رکاوٹیں ختم ہونی چاہئے اور نئے قسم کے مناظر، نئے مشاہدات، عقل و فکر کے نئے تجربات اور موجودہ معاشی و معاشرتی مسائل کا بیان سادہ اور آسان زبان میں ہونا چاہئے۔

یہ نیا طرز متعارف ہونے کے بعد فارسی ادب میں ایسے بہت سارے شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اس طرز کو اپنا کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا کیونکہ اس طرز میں شعر کہنا کلاسیکی طرز کے بہ نسبت کافی آسان ہے۔ البتہ ہر شاعری کو شعر نو کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بعض شاعری تو بالکل طرز نثر میں لکھی گئی ہے جسے شعر کا نام دینا گویا شاعری کی توہین ہے۔ اس طرح تو نظم و نثر کا فرق ہی مٹ جاتا ہے۔ نیما یوشیج نے شعر نو متعارف کرنے کے باوجود وزن اور قالب سے رو گردانی نہیں کی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ شعر کے لئے وزن ہونا ضروری ہے خواہ وہ کلاسیکی انداز میں ہو یا آزاد طرز میں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میری کوشش یہ ہے کہ میں وزن کو اس قید سے نکال دوں اور اس کو قدرتی آہنگ کے طور پر اشعار کے مختلف مطالب کے اظہار کے لئے وجود میں لاؤں، کیونکہ جب لوگ شعر سنتے ہیں تو وہ اسے ایسے آہنگ میں چاہتے ہیں جس میں وہ خود ان اشعار کو گا کر پڑھ سکیں''[11]۔ خلاصہ یہ ہے کہ چھوٹے بڑے جملوں میں کہے ہوئے ہر کلام کو ہم شعر نو کا نام نہیں دے سکتے بلکہ اس میں ایک مناسب وزن کی اہم ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نیما کے کلام سے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

قوقولی قو خروس می خواند از درون نهفت خلوت ده
از نشیب رهی که چون رگ خشک در تن مردگان دواند خون
می تند برجدار سرد سحر می تراود بهر سوی هامون
با نوایش، از او، ره آمد، پُر مژده می آورد به گوش، آزاد
می نماید، رهش به آبادان، کاروان را، در این خراب آباد[12]

[11] نیا ایرانی ادب، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، ضیائے ادب، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۱۴۰

[12] نیما یوشیج، مجموعہ شعر نیما، بحوالہ ویب سائٹ: https://cheraghak.com/nima-yooshij/divan_nima_yooshij/khoros_mikhanad

نیما کے بعد اس طرز کی پیروی کی گئی لیکن ان سبھی شعرا کو ہم طرز نیما کے شعرا نہیں کہہ سکتے، بلکہ ان کے کلام کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ شعر نیمائی، شعر سپید اور شعر موج نو۔

شعرِ نیمائی: یہ وہی طرز ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس طرز میں عروضی اوزان کی رعایت تو کی جاتی ہے البتہ قافیہ کی جگہ مشخص نہیں ہوتی۔ اس طرز کے شعرا میں مہدی اخوان ثالث، فروغ فرخ زاد، سہراب سپہری وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

شعرِ سپید: اس طرز میں اگرچہ آھنگ ہے البتہ یہ شعر عروضی اوزان سے محروم ہے۔ اس میں بھی شعر نیمائی کی طرح قافیہ کی جگہ مشخص نہیں ہے۔

شعرِ موج نو: اس طرز میں نہ ہی عروضی اوزان ہے نہ قافیہ، بلکہ اس کی ہیئت نثر سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ نثر اور اس کے بیچ ایک بنیادی فرق اس کے اندر کا شعری تخیل ہے۔

تیسرا دور (انقلاب اسلامی کے بعد کا دور)

انقلابِ اسلامی (۱۹۷۹ء) کے بعد فارسی ادب میں ایک نئے ادبی رجحان نے زور پکڑا اور ایک نئے طرز کا ادب وجود میں آنے لگا جسے حماسی ادب یا ادبیاتِ پایداری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ قدیم شعرا جیسے فردوسی وغیرہ نے بھی اس طرز کی شاعری کی ہے لیکن اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ انقلاب اسلامی کے بعد اس رجحان نے بہت زور پکڑا اور اس طرز کا کافی منظوم ادب وجود میں آیا۔ اس قسم کے ادب میں جنگ، شہید، شہادت، لہو، انقلاب، قربانی، شجاعت، استقامت، رہبر کی اطاعت، ملک کی حفاظت، دینی اقدار، خدا، قیامت، روحانیت وغیرہ جیسے موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ اس طرح کے معنوی رجحانات کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب حکومتی ظلم وجور اور جنگ کو قرار دیا جاسکتا ہے، خاص کر ایران اور عراق کے بیچ آٹھ سالہ جنگ نے اس طرح کا ادب پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ جنگ انقلاب کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی جسے عراق نے ایران پر مسلط کر دیا تھا۔ انقلاب تازہ تازہ ہی برپا ہوا تھا جس نے پورے ایران کو اسلامی جوش وجذبہ اور معنویت سے بھر دیا تھا۔ اس کا اظہار ایرانی سخنوروں نے منظوم ومنثور دونوں طریقوں سے کیا۔ اس دور میں وافر مقدار میں حماسی ادب وجود میں آیا، ایران میں اس ادب کو ''ادبیاتِ دفاعِ مقدس'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرز کی انقلابی اور حماسی شاعری میں شہریار کے ساتھ ساتھ حمید سبزواری بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ حمید سبزواری کو ''پدرِ شعرِ انقلاب'' کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اس طرز کے شعرا میں سے احمد عزیزی، قیصر امین پور، نصر اللہ

مردانی، فاطمہ راکعی، حمید رضا برقعہ ای، سپیدہ کاشانی، محمود پور وہاب، سلمان ہراتی، ناصر فیض وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس طرز کے چند شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

قیصر امین پور

بر این زین خالی نہ گردی، نہ مردی — !دلا زین غم ار خون نگردی، نہ مردی
نہ من پرکنم جای ہمچون تویی را — کجا پر شود جای گردی، بہ گردی؟
گذشتن زِسر، سرگذشتی است خونین — دلا کی تو این رہ، بہ زردی نَوردی؟

نصر اللہ مردانی

نام نورانیٔ تودر افق یاد شکفت — روح خورشید در آئینۂ میعاد شکفت
آب و آتش بہ ہم آمیخت در آغاز حیات — غنچۂ بستۂ دل در دمِ میلاد شکفت
سینۂ سرد زمین صاعقۂ عشق شکافت — بر لب خشک زمان چشمۂ فریاد شکفت
بادۂ سبز دعا در خم جوشندۂ دل — تا در اندیشۂ ما شور تو افتاد شکفت

ہادی فردوسی

ما گرد مداری از خطر می گردیم — تا صبح بہ دنبال سحر می گردیم
سوگند بہ لالہ ہا کہ ہمچون خورشید — زرد آمدہ ایم و سرخ برمی گردیم

اصغر عظیمی مہر

مردان غیور قصہ ہا برگردید — یکبار دگر بہ شہر ما برگردید
دیروز بہ خاطر خدا می رفتید — امروز بخاطر خدا برگردید

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں جو نئے ادبی رجحانات فارسی ادب میں پیدا ہوئے انہوں نے فارسی ادب کے دامن اور اس کے خزانے میں کافی وسعت پیدا کر دی ہے۔ نیما کے ’’شعرِ نو‘‘ نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ چونکہ اس طرز میں شعر کہنا کلاسیکی طرز کی بہ نسبت کافی آسان ہے، لہذا بہت سارے ایسے شعرا وجود میں آئے جنہوں نے اس نئے قالب (شعر نو) کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ اس صدی میں ایک اہم ادبی رجحان انقلابی و حماسی شاعری کا ظہور ہے، جس نے لوگوں میں آزادی طلبی، جذبۂ ایثار، وطن دوستی، جذبۂ شہادت اور دشمن کے مقابل ذوقِ استقامت جیسے دینی و معنوی رجحانات کو فروغ دیا۔ علاوہ ازیں ان جدید رجحانات نے فارسی ادب کو عوام کے انتہائی قریب لا کھڑا کیا جس کی وجہ سے ایسا ادب وجود میں آیا جس میں لوگوں کے ذاتی مسائل ومشکلات، درد و کرب، جانفشانی و قربانی اور شجاعت و استقامت کی عکاسی ملتی ہے۔

متنبی کی شاعری میں غزل گوئی

ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی، مانو، حیدرآباد

dmsharfealam@gmail.com

متنبی کا نام ابوالطیب احمد بن حسین بن حسن بن عبدالصمد الجعفی المتنبی تھا۔ اس کی پیدائش ۳۰۳ھ میں کوفہ کے ایک محلہ کندہ میں ہوئی۔[1] بچپن کا ابتدائی زمانہ یہیں بسر ہوا۔ اس کے خاندان کی حالت بہت خستہ تھی، اس کا باپ ایک سقہ تھا جو محلہ والوں کے گھروں میں پانی بھرتا تھا۔ ابتدائی تعلیم اس نے کندہ میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے اس کی ذہانت و فطانت کی شہرت ہوئی اور اپنے حیرت انگیز حافظے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان ممتاز ہو گیا۔ بچپن میں وہ شیعہ کے زیدیہ فرقہ کے زیر اثر رہا[2] اور اس نے اس فرقہ کا اثر قبول کیا اور اس کو فلسفہ اور شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ اور ۳۱۲ھ/۹۲۴ء میں قرامطہ نے کوفہ پر حملہ کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کیا تو اس کے خاندان نے سماوہ[3] نامی گاؤں میں ہجرت کر کے اقامت اختیار کی۔ اس گاؤں میں رہنے کی وجہ سے متنبی پر عربی ادب کا اثر گہرا پڑا اور عربی ادب پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی۔ اور جب متنبی ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں کوفہ واپس آیا، تو وہ شعر و شاعری کے شغف میں مشغول ہو چکا تھا۔

متنبی نے اپنے ہم عصر شعراء کی طرح قصیدہ گوئی کو حصول رزق کا ذریعہ بنایا اور ابوالفضل کوفی کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔[4] پھر اس نے بغداد کا رخ کیا جو اس زمانے میں علم و ہنر کا گہوارہ تھا۔ یہاں بھی اس کی دلبستگی نہ ہوئی تو اس نے شام کی طرف رخت سفر باندھا۔ اس زمانے کے اشعار میں اس پر ابو تمام اور

---

[1] الزرکلی: خیر الدین، الاعلام، بیروت، دار العلم للملایین، ۲۰۲۲ء، ص ۱۱۵

[2] البغدادی، عبدالقادر، ایضاح المشکل لشعر المتنبی، قاہرہ، خزانۃ الأدب، ج ۱، ص ۳۸۲

[3] سماوہ مشرق میں سواد کوفہ اور مغرب میں تدمر کے درمیان واقع ہے: الحمدی، شہاب الدین ابو عبداللہ، معجم البلدان، بیروت، دار صادر، ج ۳، ص ۲۴

[4] الواحدی، ابوالحسن احمد بن محمد بن علی، شرح دیوان المتنبی، ص ۲۱

البحتری کی شاعری کا اثر غالب ہے۔

متنبی نے اپنی شاعری اور دربار سے وابستگی کے ساتھ اساتذۂ فن سے بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا، اوران سے استفادہ کرتا رہا۔ ان میں زجاج، ابن السراج ابوالحسن اخفش، ابو بکر محمد بن درید اور ابو علی فارسی کا نام سرفہرست ہے۔ ان اساتذہ سے استفادے کے ساتھ ان کو اپنی صلاحیت سے متاثر بھی کیا، چنانچہ امام فن ابو علی فارسی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دن متنبی سے امتحان کے طور پر پوچھا کہ عربی میں فعلی کے وزن پر کتنی جمعیں آتی ہیں تو متنبی نے برجستہ جواب دیا: حجلی اور ظربی۔ بات ختم ہوگئی۔ ابو علی فارسی کا کہنا یہ ہے کہ اس کے بعد میں نے تین دن اور تین رات مسلسل لغت کی کتابوں کو چھان مارا کہ ان جمعوں کے علاوہ تیسری جمع تلاش کرلوں مگر میں ناکام رہا۔ اور متنبی نے جو جواب دیا تھا وہ حرف آخر ثابت ہوا۔

متنبی اپنی شاعری کے عروج کے زمانے سے آخری عمر تک متعدد درباروں سے وابستہ رہا۔ جب تک اس پر انعام واکرام کی بارش ہوتی رہی، وہ مدح سرائی میں مشغول رہا، اور جب ذرا سی بدمزگی پیدا ہوئی تو اس نے دربار کو چھوڑ دیا، اور کسی دوسرے دربار سے اپنا سلسلہ جوڑ لیا۔ چنانچہ ۳۳۷ھ/۹۴۸ء میں حلب میں امیر سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوگیا اور نو سال تک اس کے دربار سے منسلک رہا۔

ادبی اعتبار سے متنبی کا یہ دور سنہرا سمجھا جاتا ہے۔ محققین اس بات پر متفق ہیں کہ متنبی کی اس دور کی شاعری منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔[۵] وہ ۳۳۷ھ/۹۴۸ء میں سیف الدولہ کے مصاحبوں کے رسہ کشی کی وجہ سے مصر میں فسطاط کے کافور الاخشیدی کے پاس چلا گیا۔ کافور نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور وعدہ کیا کہ اس کو صیدا کا حاکم مقرر کردے گا۔ کافور نے وعدہ وفا نہ کیا۔ متنبی اس کے پاس تیرہ سال رہا۔ وہ اس کی وعدہ خلافی کے پیش نظر کافور کو ناپسند کرتا تھا، لیکن بدرجہ مجبوری اس کی مدح سرائی کرتا رہا۔[۶] پھر مایوس ہوکر اس کی ہجو کی، جو عربی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ۳۵۴ھ/۹۶۵ء میں وہ فارس پہنچا اور سلطان عضد الدولہ کے پاس شیراز چلا گیا۔ اس نے عضد الدولہ کی شان میں کئی قصائد لکھے جو متنبی کے بہترین قصیدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں اس نے عضد الدولہ کو بھی خیر باد

---

[۵] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، دانش گاہ، پنجاب، ۱۹۸۵، ج۱۸، ص ۵۱۳

[۶] الدمشقی، یوسف البدیعی، الصبح المنبی عن حیثیۃ المتنبی، مصر، دار المعارف ۱۹۳۴ء، ج۱، ص ۱۲۵

کہہ دیا۔[۷]

بہر حال متنبی وہاں سے واپس ہوا اور بغداد کے قریب ایک گاؤں میں متنبی کی ملاقات فاتک بن ابی جہل بن خراش بن شداد الاسدی سے ہوئی جو ضبہ بن یزید العتبی کا ماموں تھا۔ متنبی نے ضبہ کی ہجو میں ایک دلخراش قصیدہ لکھا تھا۔ قصیدہ زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ اس قصیدے میں متنبی نے ضبہ کو نہایت ناشائستہ الفاظ میں مغلظات سنائی تھی، اور ضبہ کی والدہ پر گندے جملے کسے تھے۔ ضبہ کی ماں فاتک اسدی کی حقیقی بہن تھی۔ فاتک نے جس دن سے قصیدہ سنا تھا، اسی دن سے اس نے متنبی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ پندرہ بیس آدمیوں کو لے کر متنبی کی تاک میں لگا رہا۔ اتفاق سے متنبی فارس سے واپسی میں بغداد کے قریب فاتک کو مل گیا۔ متنبی کے ساتھ اس کا لڑکا محمد اور غلام مفلح بھی تھا۔ فاتک نے اپنے جتھوں سمیت متنبی اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا اور ان تینوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا۔[۸] یہ سانحہ ۲۸، رمضان ۳۵۲ھ میں پیش آیا اور یوں ایک قادر الکلام، پر گو، عظیم المرتبت قد آور شاعر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا اور اس کی لاش ایک ریتیلے میدان میں بے گور و کفن پڑی رہ گئی۔

عربی شاعری میں غزل گوئی کا آغاز:

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں خلافت بنوامیہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ انھوں نے ساری مخالف طاقتوں کو سرنگوں کر دیا۔ ان کے فولادی ہاتھوں نے مخالفین کی غیرت و خودداری کا گلا گھونٹ دیا۔ ایسے سسکتے ماحول میں عروس غزل وجود میں آئی اور اس کے ساتھ مغنیوں کا قافلہ ہمرکاب ہو گیا۔ درد و غم کی پروردہ غزلوں اور مغنی کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے نے جذبات کی کشمکش کو راحت دی۔ شاعر غم میں ڈوب کر غزل لکھتا مغنی گا کر اس غم کو دوآتشہ بنا دیتے اور اس کے کیف میں ان کا دل جھومنے لگتا تھا۔

ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں غزل کی ابتداء ہوئی۔ وہ دلوں کی کسک اور جذبات کی خلش لے کر آئی۔ اس دور میں غزل میں سوز و گداز پایا جاتا تھا۔ غم انسانی زندگی کا مؤثر ترین پہلو ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو درد و کرب میں دیکھ کر متاثر ہو جاتا ہے۔ ایسی شاعری بہت جلد قبولیت کی سند حاصل کر لیتی ہے جس میں زندگی کا غم ہو، چاہے وہ غم جاناں ہو یا غم دوراں۔ اس کی ٹیس ہر دل محسوس کرتا ہے اور شاعر کا

---

[۷] الواحدی، ابوالحسن احمد بن حمد بن علی، شرح دیوان المتنبی، ص ۷۶۶

[۸] الدمشقی، یوسف البدیعی، الصبح المنبی عن حیثیۃ المتنبی، ج ۱، ص ۲۳۹

ہم نوا بن جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے جو شاعری چلی آرہی تھی، وہ پہلی صدی ہجری میں کمال کو پہنچ جاتی ہے، اس کے بعد عربی شاعری ایک نئے دور میں قدم رکھتی ہے جو عربوں کی اصل شاعری سے مختلف ہے۔ اس وقت تک عرب و عجم کی دوری سمٹ چکی تھی۔ تہذیب و ثقافت متاثر ہوئی اور خیالات کا تبادلہ شروع ہوا۔ اور اس طرح عرب کی شاعری عجم سے متاثر ہوئی۔ عربی شاعری کی سادگی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ سادگی نے، جو شاعری کے چہرے کا غازہ تھی، رخصت ہونے میں عافیت محسوس کی۔ اس وقت زندگی کے سامنے ایک وسیع و عریض دنیا تھی، اور غزل نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی، اور جو پہلو اس کے مزاج کے مطابق محسوس ہوا اس کو اپنا بنالیا۔ غزل اس دور میں شہد کی مکھی کی طرح ہوگئی، وہ سیکڑوں قسم کے پھولوں سے اس کی حلاوت چرا کر لاتی اور جمع کرتی، پھر شہد جیسے شیریں مشروب کا جام ارغوانی بنا کر پیش کرتی۔ اس وقت غزل صرف سسکتے جذبات کی عکاسی ہی نہیں کرتی تھی، بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے لگی۔ اگر شاعر وقت کے ان دھاروں پر انگلی رکھ دیتا تو اسے عظیم شاعر سمجھا جاتا تھا۔

متنبی کا جب دور آیا تو اسے دنیائے ادب میں عظمت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ گرچہ اس کا دل درد آشنا نہیں تھا، سوز و گداز سے اس کو واسطہ نہیں تھا، وہ عشق و محبت کے کوچہ سے نابلد تھا، عورت ذات سے اسے ایک قسم کی نفرت تھی۔ وہ ہوس پرستی کی لذت سے مکمل ناشناس تھا۔ اس لیے اس کے یہاں واردات دل اور محبت کی تلاطم خیزیاں نہیں ملتیں، اور دو دلوں کے رشتے کی ترجمانی میں نزاکت نہیں ملتی، جو جان غزل ہے۔ اس کے باوجود متنبی غزل کو اتنا دے گیا ہے، جس سے اس کمی کا احساس مٹ جاتا ہے۔ اس کے تخیل کی بلند پروازی نے تشبیہات و تمثیلات اور خوبصورت استعارے کے ایسے انمول شاہکار پیش کیے ہیں جس نے آج ایوان غزل کی زیبائش کے بنیادی عنصر کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اور آج بھی ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ان میں وہی شادابی پائی جاتی ہے۔ اور متنبی کی سیکڑوں تمثیلات تشبیہات فارسی میں ڈھل کر اردو میں منتقل ہوئیں، اور متنبی، جو ان تشبیہات و تمثیلات کا مورث اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، کا نام لیے بغیر اس کا سارا اثاثہ تقسیم کرلیا گیا۔

عربی کے دیگر شعراء نے غزلیات میں انوکھے انداز میں دلوں میں کسک اور گدازی پیدا کی۔ لوگ ان غزلوں پر سر دھنتے رہے، لیکن وہ وقت کی آواز تھی۔ مستقبل کے لیے انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا، اور آج وہ تمثیلات و تشبیہات پردۂ خفا میں چلی گئیں۔ وہ غزلیں ذاتی درد والم کی داستان بن کر رہ گئیں۔ مستقبل

کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہ کرسکے اور قدامت پرستی کے خوگر رہے۔ اس لیے قصۂ پارینہ کے درجے میں چلے گئے۔ اس کے برخلاف متنبی نے ماضی میں نہیں جھانکا، بلکہ اس کی نگاہیں ہمہ وقت آنے والے وقت پر ٹکی رہیں۔ اس لیے متنبی کو زندہ جاوید ہونے کا درجہ حاصل ہوا۔

متنبی کا تعلق چوتھی صدی ہجری کی ابتداء سے ہے۔ اس وقت عربی حکومت کا پایۂ تخت بغداد تھا۔ عجمیوں سے اختلاط کی شدت کے پیش نظر عربوں کا تمدن بدل گیا تھا، ان کی سادگی رخصت ہوگئی تھی، ان کے مضامین کی نوعیت، خیالات کی طرز ادا، غزل کے سرمایہ کی خمیر اور حقیقت نگاری وغیرہ رخت سفر باندھ چکی تھی۔ عباسی خلفاء کی ثقافت مسلم سلاطین کے شاہانہ کروفر اور عوام کی فارغ البالی کی وجہ سے سب تبدیل ہوچکے تھے۔ رہنے سہنے کا ڈھنگ، پہننے اوڑھنے کا طریقہ اور تعمیرات وغیرہ میں نزاکت طبع کا خیال رکھا جانے لگا۔ اس کا اثر شعراء پر بھی پڑا، اور ان کے خیالات میں نزاکت اور قصائد وغزلیات میں مبالغہ آرائی اوج کمال تک پہونچی۔ غزل کے لیے فضا سازگار تھی لیکن وہ غزل پیدا نہ ہوسکی جو متنبی نے اپنے قصائد کی تشبیب کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تاریخ میں جنسی محبت کی چند رنگین اور شوخ داستانیں پائی جاتی ہیں جو شاعری کی حریری لباس میں نمودار ہوئیں لیکن غزل کی نقاب کشائی کے لیے اب بھی ایسے ہاتھ کی ضرورت تھی جس سے غزل کی آبرو کو چار چاند لگ جائے۔ ایسے ماحول میں عربی شاعری کو متنبی مل گیا۔ جس نے اس کے نوک و پلک کو سنوارا، اس کی آنکھوں میں ایسی طلسم پیدا کیا جس سے ہر ایک اس کا شکار ہوگیا اور عرب کی نگاہوں کو اپنا مرکز نگاہ بنالیا۔ یوں متنبی کی شاعری عرب و عجم کے لیے سنگم کی حیثیت اختیار کرلی۔ چنانچہ متنبی ایک طرف عرب شاعروں کی طرح پہاڑوں کی بلندی، چشموں کی روانی، بادلوں کی جھڑی، بادسموم کے جھونکے، اونٹوں کے ڈیل وڈول، گھوڑوں کی تیز رفتاری، سفر کی دشواری، دیار حبیب کی ویرانی کی منظر کشی کرتا ہے تو دوسری طرح محبوب کی مخمور نگاہوں میں سرخ ڈورے کو تلوار سے تشبیہ دیتا ہے۔ محبوبہ کے زلف دراز کو شب ہجراں کی درازی سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ سب عجم کا عطیہ ہیں۔ اس لیے متنبی کے زمانے میں اور اس کے بعد تمام شاعروں نے اس کی خوشہ چینی کی ہے۔ متنبی نے جس گل بوٹوں سے شاعری کے ذہن کو سجایا ہے۔ وہ سب اس نے عجم کے چمنستانوں سے کشید کیا ہے۔ ذیل میں متنبی کے غزل کے کچھ نمونے پیش ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس نے جو تشبیہات وتمثیلات دنیا کے سامنے پیش کی تھیں، آج بھی ان کی جاذبیت ودلکشی، حسن ولطافت اور تازگی

وپاکیزگی میں فرق نہیں پیدا ہوا ہے۔ بلکہ اس گل رعنا کی دل کشی میں اضافہ ہی ہوتا گیا ہے۔

تخیل:

شاعری میں تخیل کا استعمال اہم ہے۔ تخیل یہ ہے کہ کسی چیز یا کسی حالت کی اس طرح منظر کشی کی جائے کہ وہ شئی یا حالت نگاہوں کے سامنے آجائے۔ متنبی کا ایک شعر ہے:

حاولن تفدیتی وخفن مراقباً
فوضعن ایدیہن فوق ترائباً[9]

(ان مہ جبینوں نے محبت کا اظہار کرنا چاہا لیکن لوگوں کی موجودگی سے ڈرتی رہیں،
اس لیے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ دیے)۔

متنبی نے اس سے پہلے بتایا ہے کہ قافلہ سفر کے لیے تیار ہے۔ سواریاں تیار ہو رہی ہیں۔ یہ حسن وجمال کے روشن ستارے جلد ہی ڈوب جانے والے ہیں۔ قافلہ والے ہر سو بکھرے ہوئے ہیں۔ عورتوں کا جھرمٹ ایک طرف ہے۔ جدائی کے اس دلخراش منظر میں عاشق پراگندہ دل کے ایک طرف ایستادہ ہے اور غمگیں نگاہوں سے محبوبہ کو غم کا داستان سنا رہا ہے۔ آمنے سامنے بات چیت کرنے کا موقع نہیں ہے، محبوبہ بھی مضطرب ہے اور چاہتی ہے کہ عاشق کی دل دہی کے لیے دو لفظ کہہ دے مگر مجمع ہونے کی وجہ سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر یہ اشارہ دے رہی ہے کہ میرا دل بھی تم سے کم غمگیں نہیں ہے، مگر مجبوری ہے۔ اس پورے منظر کو اگر ہم تصور کی نگاہوں سے سامنے رکھ کر متنبی کا شعر پڑھیں، تو ہمیں محسوس ہوگا کہ موقع و محل کی کتنی سچی اور واضح تصویر کشی ہے اور روزمرہ کی حقیقت کی کتنی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔

وصال/ملن:

غزلیات کی شاعری میں ''ملن''شاعری کی مسلمات میں سے ہے کہ ملن، دشوار ہے۔ شاعروں نے اس کی تعبیر کے لیے مختلف انداز بیان اختیار کیا ہے۔ لیکن متنبی نے اس کو ایسے پیرایہ بیان سے ثابت کیا ہے وہ ہر ایک کا مشاہدہ ہے:

کأنہا الشمس یعیی کف قابضہ

---

[9] دیوان المتنبی، دار بیروت، ۱۹۸۳، ص ۱۰۹، مدح علی بن منصو الحاجب

شعاعہا وبراہُ الطرف مقترباً[۱۰]

(محبوبہ چمکتے ہوئے سورج کی کرن ہے، جو ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہے لیکن کبھی ہم اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے جب ہم اس کو پکڑنے کی سعی کریں)۔ شاعر کہہ رہا ہے محبوبہ نگاہوں کے سامنے موجود بھی ہو تب بھی اس سے ملن ناممکن ہے جیسے سورج کی کرن کو مٹھی میں پکڑ لینا۔ محبوبہ کو سورج کی کرن سے تشبیہ دینا اور اس کی ضیاپاشیوں کو سورج کی کرن کہہ دینا ایک نادر انداز بیان ہے۔

چہرہ چاند:

بَدَتْ قَمَراً ومالَتْ خُوطَ بانٍ
وفاحَتْ عَنْبَراً ورَنَت غَزالا[۱۱]

(چہرہ چاند، قدزیبا میں شاخ صنوبر کی لچک، مرمریں جسم سے عنبر کی اٹھتی ہوئی خوشبو اور جنگلی ہرن کی طرح کج روی آنکھوں سے دیکھنے کا انداز لے کر وہ سامنے آئی)۔ یہ محبوبہ کے سامنے آنے کا منظر تخیل کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

چشم غزالاں:

عربی شاعری میں محبوبہ کی آنکھوں کو ہرن کی آنکھ سے اور محبوبہ کی گردن کو ہرن کی گردن سے تشبیہ دی جاتی تھی، لیکن متنبی نے چشم غزالاں کی ترکیب کو رائج کیا:

فاسقينها فدىً لعينيك نفسي
من غزالٍ وطارفي وتليدي[۱۲]

(تو اپنی ہرن جیسی آنکھوں سے مجھے سیراب کر دے، ان آنکھوں پر میری جان و مال اور ساری کائنات قربان ہو جائے)۔ چشم غزالاں کی ترکیب کے علاوہ ایک پہلو آنکھوں سے شراب پلانے کا پیدا ہوا۔ اس کے بعد آنکھوں کو پیمانہ، اور میخانہ بھی کہا گیا، اور اسی سے چشم مخمور اور چشم خمار آگین کی خوبصورت ترکیب نے جنم لیا۔

قاتل نگاہیں:

متنبی نے غزل میں نگاہوں کو قاتل کہا ہے:

---

[۱۰] دیوان المتنبی بیروت، ۱۹۸۳، ص ۷ ۹، مدح مغیث بن علی العجلی
[۱۱] دیوان المتنبی، دار بیروت، ص، ۱۴۰۔ مدح اُبا الحسن بدر بن عمار بن اِسماعیل الآمدي الطبرستاني
[۱۲] دیوان المتنبی ص ۲۰ قال فی صباہ

إن التي سفكت دمي بجفونها
لم تدر أنّ دمي الذي تتقلد[۱۳]

(اس کی قاتل نگاہوں نے میرا خون بہادیا، اور یہیں سمجھا کہ
میرا خون اس کی گردن پر ہار بن جائے گا)۔

آنکھوں کے سرخ ڈورے

بعض خوبصورت آنکھوں میں سرخ ڈورے ہوتے ہیں، جو خمار آنگیں آنکھوں کو سرخ شراب کا چھلکتا جام بنادیتے ہیں:

رأين التي للسحر في لحظاتها
سيوف ظباها من دمي أبداً حمر[۱۴]

(محبوبہ کی جادو بھری نگاہیں ہمیشہ شمشیر بدست رہتی ہیں اور آنکھوں کے سرخ ڈورے حقیقت میں
تلواروں کی دھاریں ہیں جو عاشق کے خون سے ہمیشہ سرخ رہتی ہیں)۔

زلف شب گوں

زلفوں کی سیاہی کو رات سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ زلف شب گوں کی ترکیب اسی سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ متنبی ہزار سال پہلے اس نادر تشبیہ کو اپنی غزل میں پیش کر چکا ہے:

نشرت ثلاث ذوائب من شعرها
في ليلةٍ فأرت ليا لي أربعا[۱۵]

(محبوبہ نے ایک رات اپنے بالوں کی تینوں چوٹیاں کھول کر مجھے ایک رات میں چار راتیں دکھائیں) زلفوں کی ہر چوٹی الگ الگ سیاہی میں تین راتیں بن گئیں اور ایک قدرتی رات اس طرح چار راتیں ایک رات میں جمع ہو گئیں۔

زلف دراز

زلف دراز کی شب ہجراں کی درازی سے تشبیہ متنبی کے یہاں ملتی ہے:

حكيت ياليل فرعها الوارد
فاحك نواها لجفني الساهد[۱۶]

---

[۱۳] دیوان المتنبی، ص ۷۴، مدح شجاع الطائی

[۱۴] دیوان المتنبی، ص ۶۲، مدح عبداللہ بن یحی البحری

[۱۵] دیوان المتنبی، ص ۱۱۷، مدح عبدالواحد بن عباس بن ابی الاصبع الکاتب

(اے شب ہجر! تونے اپنی درازی میں محبوبہ کی زلف درازی کی نقالی کرلی، میری بیدار آنکھوں نے جو محبوبہ کی دوری ہے، اس درازی کی تونے نقالی کیوں نہیں کی؟) کیونکہ زلفوں کی درازی اور سیاہی میں تو اس کے مشابہ ہوگئی، لیکن میری اور محبوب کی دوری کی درازی بھی اس میں شامل کرلیتی تو کیا برا تھا؟

یہ ایک ہی شعر میں زلفوں کی درازی اور اس کی سیاہی کی عمدہ مثال ہے۔

نقاب حسن

محبوبہ کا پردہ نشیں ہونا اور پردہ سے اس کی تجلیوں کا اظہار مختلف مثالوں سے ادا کیا جاتا ہے، لیکن متنبی نے پردہ کی مثال مشاہدہ کی چیز سے دی ہے۔ اس سے حقیقت واقعہ کو بیان کیا ہے:

کأن نقابہا غیم رقیق
یضئ بمنعہ البدر الطلوعا[17]

(محبوبہ کے رخ زیبا پر نقاب اس طرح ہے جیسے چودھویں کے چاند پر ایک ہلکی سی بدلی آگئی ہے، جو چاند کو صاف سامنے آنے بھی نہیں دیتی اور نہ اس کو مکمل طور پر چھپا ہی سکتی ہے) اور وہ بدلی چاند کی روشنی سے خود منور ہوگئی ہے۔

سفرت وبرقعہا الحیاء بصفرۃ
سترت محاجرھا ولم تک برقعاً[18]

(محبوبہ نے رخصت کے وقت نقاب کے رخ کو الٹ دیا۔ جدائی کے صدمے کی وجہ سے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی، اور زردی نے اس کے حسن پر پردہ ڈال دیا تھا، حالانکہ وہ بے پردہ تھی)۔

تصوریار

قرب المزار ولامزار وإنما
یغدو الجنان فنلتقي ویروح[19]

(دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار، ذرا گردن جھکائی دیکھ لی)۔

متنبی تصور میں صرف محبوب ہی نہیں دیکھتا، بلکہ تصور پر حقیقت کے ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور اس

---

[16] دیوان المتنبی، ص ۵۵۱، مدح عضد الدولۃ

[17] دیوان المتنبی، ص ۸۹، فی مدح علی بن ابراہیم التنوخی

[18] دیوان المتنبی، ص ۱۱۷، مدح عبدالواحد بن عباس بن ابی الاصبع الکاتب

[19] دیوان المتنبی، ص ۲۶، مدح مساور بن محمد الرومی

میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ محبوب کو اپنے پاس محسوس کرتا ہے۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ممثلة حتى كأن لم تفارقي وحتى كأن اليأس من وصلك الوعد
وحتى تكادي تمسحين مدامعي ويحبق في ثوبي من ريحك الند[20]

(وہ میرے محسوسات میں اس طرح پیوست ہے کہ اب وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہو گی۔ ملن سے مایوسی اس سے ملنے کا وعدہ بن گئی، اس لیے ظاہری آنکھیں اس کے دیکھنے سے مایوس ہو گئیں۔ اس وقت تصوراتی چیز میں مشاہداتی درجہ میں ہمہ وقت اس کو دیکھنے میں مشغول ہو گئیں، اور شدید قربت کے احساس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ میرے پاس آدھمکے گی اور اپنے غمگیں چہرے لیے ہوئے میرے آنسو پونچھ دے گی، اور قربت کی شدت اس طرح ہو گی کہ اس کے لمس کی شدت میرے پیرہن میں چھا گئی اور میں اس کی خوشبو میں نہا گیا)۔

عشق کے مریض کی لاغری

متنبی جسم کے وجود کو مادی شکل دیتا ہے اور روز مرہ کی زندگی سے مثال پیش کرتا ہے:

ولوقلم ألقيت في شق رأسه
من السقم ماغيرت من خط كاتب[21]

متنبی مریض عشق کی لاغری کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر میں قلم کے شگاف میں پڑ جاؤں اور کاتب اس قلم سے لکھتا چلا جائے تو تحریر میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہو گی۔

فراق کی دعاء

مریض عشق زمانہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ عاشقوں کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چنانچہ متنبی اس سلسلہ میں کہتا ہے:

وأحسب أني لو هويت فراقكم لفارقته والدهر أخبث صاحب[22]

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

تجاہل عارفانہ:

مریض عشق کی زردی کو دیکھ کر محبوبہ بڑی محبت سے پوچھتی ہے کہ کس نے تمہارا یہ حال کر دیا، اس

---

[20] دیوان المتنبی، ص ۲۰۶، مدح حسین بن علی الہمذانی

[21] دیوان المتنبی، ص ۲۲۵، مدح ابوالقاسم طاہر بن حسین بن طاہر العلوی

[22] دیوان المتنبی، ص ۲۲۵، مدح ابوالقاسم طاہر بن حسین بن طاہر العلوی

کے بعد اظہار ہمدردی کے طور پر ٹھنڈی سانس لی تاکہ اظہار ہمدردی کر سکے تو میں نے جواباً کہا کہ ایک ٹھنڈی سانس لینے والے نے میرا یہ حال کر دیا، چنانچہ متنبی کہتا ہے:

قالت وقدرأت اصفراري من به
وتنهدت فأجبتها المتنهد[۲۳]

دختِ رز:

شراب شاعری میں اس طرح دخیل ہوگئی ہے کہ اس کے لیے ہزاروں استعارے بیان کیے جاتے ہیں۔ متنبی نے ایک مثال دی ہے:

كل شئ من الدماءِ حرام
شربه ماخلا ابنة العنقود[۲۴]

(ہر طرح کا خون پینا حرام ہے سوائے ''دختِ رز'' یا ''بنت عنب'' کے اس کا پینا درست ہے)۔

تشبیہات:

متنبی کے دیوان میں بیشمار اشعار نادر تشبیہات کے ہیں۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:

فمضت وقد صبغ الحياء بياضها
لوني كما صبغ اللجين العسجد[۲۵]

(محبوبہ جب جدا ہونے لگی تو شرم وخوف کی ملی جلی کیفیت نے اس کے سفید رنگ کو بھی زرد رنگ میں تبدیل کر دیا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ چاندی پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہے۔) یہاں گورے رنگ کو چاندی سے تشبیہ دی۔ اور چہرے کی زردی کو سونے کے پانی چڑھانے سے تشبیہ دی ہے۔

حاصل کلام:

متنبی نے عروس غزل کی نوک پلک کو اپنے قلم اور فکر سے سنوارا، اور اس کا رنگ وروپ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود دھندلا نہیں ہوا۔ متنبی کی تشبیہات، تمثیلات اور استعارات میں آج تک وہی بانک پن پایا جاتا ہے اور ہر ایک شاعر متنبی کا خوشہ چین نظر آتا ہے۔

---

[۲۳] دیوان المتنبی، ص ۴۸، مدح شجاع بن محمد الطائی المنبجی
[۲۴] دیوان المتنبی، ص ۲۰، مدح قال فی صباہ
[۲۵] دیوان المتنبی، ص ۴۷، مدح شجاع بن محمد الطائی المنبجی

زبانوں کی قواعدی اصطلاحات کا تنقیدی جائزہ

محمد عاطف صدیقی

ریسرچ اسکالر، مہرشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی، اجمیر

کسی بھی زبان کے قواعد ہمیں اس زبان کو صحیح لکھنے اور بولنے کا قاعدہ سکھاتے ہیں۔ زبان اور قواعد میں گہرا تعلق ہے۔ پہلے کوئی زبان وجود میں آتی ہے پھر بعد میں اس کے قواعد بنتے ہیں یا یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ قواعد زبان کو ایک طے شدہ حد میں باندھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ زبان کبھی ایک جیسی نہیں رہتی۔ یہ وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کچھ نئے لفظ ملتے جاتے ہیں اور کچھ پرانے لفظوں کا استعمال ختم ہوتا جاتا ہے۔ جن الفاظ کا استعمال ختم ہوتا جاتا ہے دھیرے دھیرے وہ اپنی پہچان کھو دیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ کسی پرانی عبارت کو پڑھتے وقت ایسے لفظ آتے ہیں جو ترک کر دیے گئے ہیں تو سمجھنے کے لیے لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبان میں جو بدلاؤ ہوتا ہے اور نئے نئے لفظ شامل ہوتے ہیں، فن قواعد ان سب کی جانچ پرکھ کرتا ہے اور ان کے استعمال کے لیے اصول بتاتا ہے۔

زبان کے لیے قاعدے مقرر کرنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ پہلے بول چال پر خاص توجہ دی جائے کیونکہ قواعد میں اوّل درجہ آواز کا ہے اور حروف اس کے بعد میں آتے ہیں اس لیے پہلے بول چال ہے بعد میں تحریر۔ تحریر میں لفظ ایک ہی صورت میں رہتا ہے اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن بول چال میں لہجے اور موقع کے حساب سے ایک لفظ کی کئی کئی صورتیں ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے بات بول چال کے سب سے چھوٹے جز یعنی جملے سے کرنی چاہئے اسی کے ذریعے ایک شخص دوسرے شخص کی بات کو سمجھتا ہے کیونکہ کوئی کتنی ہی کم سے کم بات کرے وہ کسی جملے سے کم نہ ہوگی۔ جملے سے الگ خالی لفظ کوئی خاص معنی نہیں دیتا اس کا صحیح مفہوم اس وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی جملے میں آئے۔

قواعد نویسوں نے جملوں کو بہ آسانی سمجھنے کے لیے اسے تین خاص حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصے میں سادہ آوازیں آتی ہیں، ان کی تحریری علامتوں میں تمام طرح کے حروف آتے ہیں، جن کو ''ہجا'' کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایک سے زائد ملی ہوئی آوازوں جن کی تحریری علامتیں الفاظ

کہلاتی ہیں۔ان کی تقسیم اوران کے ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے ان میں جو تغیر و تبدل ہوتا ہے یا ان میں کچھ اضافے سے جو نئی صورت پیدا ہوتی ہے،اسی کو ''صرف'' نام دیا گیا ہے۔اسی طرح تیسرے حصے میں بحث کی جاتی ہے کہ جملے میں لفظوں کا ایک دوسرے سے باہمی تعلق کیا ہے۔ جملے میں شامل لفظ کا ظاہر ، باطن اور مفہوم و معنی کیا ہیں،اس کو قواعد میں ''نحو'' کہا جاتا ہے۔

زمانۂ قدیم سے قواعد کے اصولوں کو بیان کرنے میں محنت و علمیت کا ثبوت دیا گیا ہے،ان عالموں یعنی قواعد نویسوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ قواعد کی کتب کا مطالعہ کرنے پر دو تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ اردو کے قواعد کے اصول جس قدر ہندوستانی ہیں، اصطلاحات اسی قدر فارسی و عربی پر مبنی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اردو قواعد کی ابتدائی کتابیں پوری کی پوری فارسی میں لکھی گئی ہیں۔انشاءاللہ خاں انشاء کی ''دریاے لطافت'' سامنے کی مثال ہے۔اس کے علاوہ قواعد کی کتابوں میں اصول تو بیان کیے گئے ہیں لیکن اصطلاحات کی تفہیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔اصطلاحات کی فرہنگ سازی کا بھی کوئی کام میری نظر سے نہیں گزرا۔ چنانچہ قواعد کی کسی اصطلاح کے معنی اور مثال کی تلاش ہو تو کتب کی ورق گردانی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔اس کے علاوہ دیگر زبانوں کے اصول قواعد سے تقابل اور ان کی اصطلاحات وغیرہ کی ادبی تحقیق بھی اردو میں کم یاب ہے۔چونکہ ہندوستانی معاشرہ ایک کثیر لسانی معاشرہ ہے لہٰذا مختلف زبانوں کے قواعد کی اصطلاحات کا تقابل ایک نہایت مفید عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے لیے درج ذیل اصطلاحات پر ایک نظر ڈالیں:

Vowel	स्वर	مصوّتہ
Consonant	व्यंजन	مصمّتہ
Noun	संज्ञा	اسم
Pronoun	सर्वनाम	ضمیر
Adjective	विशेषण	صفت
Tense	काल	زمانہ
Verb	क्रिया	فعل
Case	कारक	حالت
Compound	समास	مرکب
Prefix	उपसर्ग	سابقہ

لاحقہ प्रत्यय Suffix

یعنی تینوں زبانوں میں قواعد کے مذکورہ اصول کسی نہ کسی نام سے موجود ہیں لیکن گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ان اصطلاحات سے متعلق تصورات میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے مثال کے لیے ''حالت'' کی اصطلاح اردو میں اتنی معروف نہیں جتنی ہندی میں ''کارک'' کی اصطلاح معروف ہے اور اس کا انگریزی مترادف ''کیس'' تو شاذ و نادر ہی کسی نے سنا ہوگا۔ اس سے قطع نظر کہ قواعد کے تصورات اور ان کی اصطلاحات کا تعلق خود اس زبان کی ساخت سے ہے پھر بھی اگر بین اللسانی مطالعہ کیا جائے تو ہندی میں ''کارک'' کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہے وہ اردو یا انگریزی میں نہیں۔ کارک کی تعریف کرتے ہوئے انل کمار شرما لکھتے ہیں:

संज्ञा या सर्वनाम के जिस रूप से उसका सम्बंध वाक्य में क्रिया, अन्य संज्ञा या सर्वनाम शब्दों से जाना जाए, उसे कारक कहते हैं। पृष्ठ संख्या-69 (अराध्या व्याकरण)

اب انگریزی اصطلاح ''کیس'' کا مطالعہ کریں تو وہاں ''گرامیٹیکل اسٹیٹس آف اے ناؤن'' کا فقرہ سامنے آتا ہے۔ یعنی جملے میں اسم (اور ضمیر) کی صورتِ حال۔ اردو میں اسے حالت کہا جاتا ہے جو بہت معروف اصطلاح نہیں لیکن تینوں ہی زبانوں میں ان کے قواعدی تفاعل کی بنیادی اہمیت ہے۔ بالکل یہی صورتِ حال مرکب، سماس اور کمپاؤنڈ کی ہے۔ ہندی میں سماس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی میں دو الفاظ اس طرح ملائے جا سکتے ہیں کہ وہ ایک ترکیب بننے کی جگہ ایک لفظ بن جاتے ہیں۔ اس عمل کو ہندی میں ''سندھی'' کہتے ہیں مثلاً وِدّیالیہ لفظ میں وِدّیا اور آلیہ مل کر وِدّیالیہ ہو گیا ہے۔ یہ سندھی ہے، سماس نہیں۔ سماس میں الفاظ کی صورت نہیں بدلتی۔ اردو میں سندھی کی اصطلاح کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو قواعد کی اصطلاحات کے مطابق مرکب اور ترکیب میں ایک واضح فرق موجود ہے۔ اردو میں پابند صرفیوں پر مشتمل الفاظ کی اکائی ترکیب کہلاتی ہے مثلاً شمعِ حرم، بری بات یا لکڑی کی کاٹھی وغیرہ۔ اس کے برعکس مرکب الفاظ کی ایسی اکائی ہے جس کے دونوں اجزاء آزاد صرفیوں پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً ہاتھی دانت یا ڈاک گھر۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ اردو اصطلاحات مرکب اور ترکیب میں ''سندھی'' والا کوئی تصور موجود نہیں جبکہ اردو میں بھی ہندی اصطلاح سندھی کی طرح الفاظ کے حروف میں تبدیلی کے ساتھ ترکیبی اکائیاں بنی ہوئی ہیں جیسے مقلوبی مرکب گلاب۔ یہ اصلاً آبِ گل ہے جو قلب کے باعث گل + آب ہو گیا اور سندھی کے باعث گلاب کہلایا۔

انگریزی میں کمپاؤنڈ کی اصطلاح عموماً جملے کے لیے مستعمل ہے یعنی مرکب جملہ۔ اس مطالعے سے دو باتیں صاف طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ اردو میں ترکیب اور مرکب ایک ہی مادّے کے مشتقات ہونے کے باوجود قواعد کی رو سے دو الگ اصطلاحات ہیں اور ہندی کی سندھی کا تصوّر اردو میں ہندی کی طرح مرکزی اور نمایاں نہیں ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ زبانوں میں متعدد قواعدی اجزاء کے مشترک ہونے کے باوجود اصطلاحات کی تعریف اور ان کے معنوی تصرّفات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس اعتبار سے اصطلاحات کا مطالعہ نہ صرف دل چسپ بلکہ ضروری ہے تاکہ قواعد کے مختلف ابعاد کو بروے کار لایا جاسکے۔

اصطلاح سازی زبان کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بہت سے علوم اور مضامین سے محروم ہونا پڑ سکتا ہے۔ ایک ہی لفظ بہت سے علوم کے لیے الگ الگ معنی کا حامل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ''فعل'' کے معنی کام یا عمل کے ہیں لیکن قواعد کی اصطلاح میں ''فعل'' کے معنی ماضی، حال اور مستقبل میں سے کسی ایک زمانے میں کیے گئے یا پائے گئے عمل کا صیغہ ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اصطلاحات مختلف علوم کے لیے مختلف معنی کی حامل ہوتی ہیں۔ اصطلاح کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ کسی خاص چیز یا صورتِ حال کی پوری تعریف کو ایک دو الفاظ میں سمیٹ لیتی ہے۔ گویا یہ دریا کو کوزے میں سمیٹنے کا عمل ہے۔

چونکہ اردو قواعد کی اصطلاحات عموماً عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں اس لیے ان کو صحیح صحیح سمجھنا اور بیان کرنا ایک ناگزیر عمل ہے۔ ہر چند اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن ان میں بعض اختلافات کو دور کر کے ایک رائے پر اتفاق قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اب تک اردو میں قواعد کی اصطلاح کی کوئی فرہنگ دستیاب نہیں ہے۔ لہٰذا کسی اصطلاح کو ایک ہی کتاب میں تلاش کرنا نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ فرہنگ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی اصطلاح کو فوراً تلاش کر سکتے ہیں اور اس کے صحیح معنی بھی بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر میں نے اپنی تحقیق کے لیے ''فرہنگِ اصطلاحاتِ قواعد'' کا موضوع منتخب کیا۔ اس تحقیق کے چار باب ہیں۔ پہلے باب کو میں نے فرہنگ کے مبسوط مقدمے پر مشتمل کیا۔ اس باب میں قواعد نویسی کی ضرورت، طریقۂ کار اس کی اہمیت اور اردو قواعد نویسی کی تاریخ پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں اردو کی روایتی اور جدید قواعد میں فرق بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اردو قواعد میں علمِ لسانیات کا کتنا اور کس طرح استعمال ہوا ہے اس پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

اس فرہنگ میں دیگر زبانوں خاص طور پر عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کی اصطلاحات جو

اردو میں استعمال ہوتی ہیں ان پر بحث کی گئی ہے۔ قواعد کی اصطلاح سازی کی نوعیت، ان کے لغوی معنی اور اصطلاحی مفاہیم وغیرہ کے رجحانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اگر کہیں کسی اصطلاح کے املا، تلفظ اور مفہوم وغیرہ پر علماء میں اختلاف پایا گیا تو ایسے مباحث پر ضروری توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

تحقیق کا دوسرا باب اصل فرہنگ پر مشتمل ہے۔ یہ فرہنگ لغت نویسی کے تمام جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔ قواعد کی قدیم اور جدید کتابوں سے اصطلاحات جمع کی گئی ہیں۔ پھر ان اصطلاحات کو الف بائی ترتیب سے جمایا گیا ہے۔ اصطلاح کی املا اور تلفظ پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے۔ اصطلاح کس زبان کی ہے اور اس کے لغوی معنی کیا ہیں۔ غرض یہ کہ پوری کوشش کرکے ہر اصطلاح کی صحیح اور آسان تعریف کی گئی ہے۔ جہاں جہاں ضرورت ہوئی اردو اصطلاحات کے ہندی اور انگریزی متبادل بھی لکھے گئے ہیں اور اردو کے مستند مصنفین کی عبارتوں سے مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

تیسرے باب میں ہندی اور انگریزی کی بعض مشترک اصطلاحات کا ضمیمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں فرہنگ میں شامل اصطلاحات کے انگریزی معانی کو الفابیٹیکل ترتیب سے جمایا گیا ہے۔ جو حضرات اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ دیکھنا چاہیں تو انھیں سہولت ہوگی۔ اسی طرح اردو کی خاص خاص اصطلاحات کو ہندی میں کیا کہا جاتا ہے اس کو بھی مختصراً پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے اور آخری باب میں ان تمام کتب، رسائل، اخبارات اور لغات و فرہنگیات کی فہرست دی گئی ہے۔ جن کا استعمال اس فرہنگ کو ترتیب دینے میں کیا گیا ہے۔ ان میں ہندی، انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کی کتب، لغات اور فرہنگیات وغیرہ شامل ہیں۔

آخر میں، یہ عرض ہے کہ اردو یا فارسی میں قواعدی اصطلاحات سے متعلق کوئی فرہنگ میری نظر سے نہیں گزری۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ یہ کام اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے، اس لیے اس کی افادیت بھی مسلم ہے۔ میں نے اپنی تحقیق کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحقیق ایک مشکل عمل ہے۔ توفیق ایزدی سے اس تحقیق کو بہ آسانی تکمیل تک پہنچا سکا ہوں۔ اور یقین ہے کہ اس کام سے اردو زبان و ادب کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ اب طلباء کو قواعد کی اصطلاح تلاش کرنے میں کتاب در کتاب بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اور اصطلاحات کو فرہنگ کے طور پر یکجا کرنے کی میری اس کوشش سے زبان و ادب کی ترویج و تفہیم میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔

مغل دربار میں سنسکرت زبان وادب کی اہمیت

اکرام الحق

ریسرچ اسکالر، سنٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی

سنسکرت زبان وادب کا مغل دربار میں کیا مقام تھا؟ سنسکرت ادبا و اہل علم کے مغل حکمرانوں سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ سنسکرت زبان میں مدون قدیم ہندوستانی علوم سے مغل حکمراں خاندان اور طبقۂ امرا کو کس طرح کا شغف تھا اور سلطنت مغلیہ کے فرمانرواؤں نے کیوں ان علوم کی سرپرستی کی؟ ہندوستان کی کلاسیکی زبان اور اس کے ادبی و تہذیبی سرمایہ نے کیونکر مغل سلطنت کی سیاسی، ادبی، علمی، اور فلسفیانہ سرگرمیوں کو ایک نئی جہت عطا کی؟ یہ وہ چند بنیادی سوالات ہیں جو ابھی تک ہندوستانی مورخین کے دائرہ تحقیق سے باہر تھے، باوجود اس کے کہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے مختلف تاریخی پہلوؤں اور اس کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے یہ سوالات انتہائی اہم ہیں، مصنفہ آدرے ترشکے نے، جور تگرز یونیورسٹی، نوراک میں جنوب ایشیائی تاریخ کی پروفیسر ہیں، عہد وسطی کی تاریخ نویسی کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے پوری علمی سنجیدگی کے ساتھ اپنی کتاب[1] CourtCulture of Encounters: Sanskrit at the Mughal میں پہلی بار ان سوالوں کی تحقیق کی ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کے بعض نکات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

> گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ہندوستانی تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ۱۹۸۰ تک ہندوستانی مورخین کی تحقیقی کاوشیں بنیادی طور پر سیاسی نظام، انتظامی ڈھانچہ اور معاشی نظم و نسق کو سمجھنے تک محدود تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب مارکسی مورخین نے چند خاص نظریاتی بنیادوں پر ہندوستان کے عہد رفتہ کی تلاش و جستجو شروع کی تھی، جس میں معاشی دروبست اور سیاسی وانتظامی

---

[1] مصنفہ کا انگریزی نام Audrey Truschke ہے۔ ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ یہ کتاب Penguin, U.K. سے پہلی بار ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی، Penguin Random House, India سے ۲۰۱۷ء میں اور کولمبیا یونیورسٹی پیرس سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی۔ مقالہ نگار نے وضاحت نہیں کی ہے کہ اس نے کس ایڈیشن کو پیش نظر رکھا ہے (ک۔ص اصلاحی)

ڈھانچہ کے آپسی تال میل پر خاص توجہ دی گئی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکسی طرزتاریخ نویسی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستانی تاریخ کے متعدد پیچیدہ پہلوؤں کو جدید تاریخی اصولوں کی روشنی میں اجاگر کیا ہے، بلکہ ہندوستان کے شاندار ماضی کو فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کے عفریت سے بھی محفوظ رکھا ہے لیکن اپنے محدود نظریاتی مفروضات کی وجہ سے یہ مورخین تاریخ کے ان امور پر کوئی خاص توجہ نہیں دے سکے جو کسی بھی تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔چنانچہ بعض اہم موضوعات جیسے مذہب اور اس کا فکری و علمی ارتقا، لسانی وادبی روایت، فنون لطیفہ اور بین الثقافتی تبادلے (cross-cultural interactions)، وغیرہ کبھی بھی ان کی بحث کا مرکزی حصہ نہیں رہے۔

۱۹۸۰ء میں یہ فکری جمود ٹوٹا اور مارکسی تاریخی مفروضات کو حاصل غیر معمولی مقبولیت میں ایکا یک گراوٹ آئی، دیکھتے ہی دیکھتے فقط ایک دہائی میں متعدد ایسی کتابیں منظر عام پر آگئیں جنھوں نے تاریخ نویسی کے ایک نئے دور کی بنا رکھنے کے ساتھ ساتھ مارکسی انداز فکر کی کمر ہی توڑ دی، زیر نظر کتاب بھی اسی جدید سلسلہ تاریخ نویسی کی ایک کڑی ہے، جو سلطنت مغلیہ میں سنسکرت زبان وادب کی اہمیت اور کردار کا تاریخی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

یہ کتاب دو پہلوؤں سے بہت اہم ہے۔اول یہ کہ اس کتاب میں ایک نیا موضوع زیر بحث ہے جو بالخصوص عہد وسطی کی تہذیبی و ثقافتی روایت کو سمجھنے کے لئے از حد ضروری ہے۔دوسرے یہ کہ مصنفہ نے اس کتاب میں اس تاریخی جھوٹ اور سیاسی پروپیگنڈہ کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو اکثر وبیشتر عہد وسطی کے مسلم حکمرانوں کے خلاف کیا جاتا رہا ہے ہندوستانی اور سامراجی مورخین کی ایک بڑی جماعت نے اپنی تحریروں میں یہ الزام تراشی کی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کو قتل کیا اور انھیں جبراً اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا، بلکہ قدیم ہندوستانی تہذیب کے سنہری دور کو بھی ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا۔ہندوستانی مورخین کے درمیان اس نظریہ کی مقبولیت کی وجہ بہت حد تک وہ فرقہ وارانہ زہر تھا جو آزادی سے قبل ہندوستان کی سیاسی، سماجی، اور علمی فضا میں سرایت کر چکا تھا۔

اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ گزشتہ چند سالوں میں یہ نفرت انگیز پروپیگنڈہ ایک مرتبہ پھر زور پکڑ چکا ہے مصنفہ نے تاریخی دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ، عام مفروضہ کے برخلاف، سنسکرت ادباو دانشوروں کو دربار مغلیہ میں خاص عنایات حاصل تھیں اور سنسکرت زبان اپنی تمام کلاسیکی روایات کے ساتھ مغل حکمرانوں کی

سرپرستی میں پھلتی پھولتی رہی۔

ذیل میں اس کتاب سے چند اقتباسات نقل کیے جارہے ہیں جس سے اس کی افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ مغل دربار میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

مغل حکمرانوں نے، جن کا فارسی کلچر سے بہت گہرا رشتہ تھا، فارسی کو ثقافتی اور انتظامی زبان کے طور پر ترقی دی۔ ۱۶ویں صدی کے وسط سے انہوں نے فارسی زبان وادب کو خوب تعاون فراہم کیا اور دربار مغلیہ کو تہذیب و ثقافت کا مکہ بنادیا جہاں ایشیا کے مختلف حصوں سے فارسی شعراء وادبا، دانشور اور فنکار کھنچے چلے آئے اس کے علاوہ بادشاہ اکبر نے ۱۵۸۲ء میں فارسی کو انتظامیہ کی سرکاری زبان کے طور پر لاگو کردیا تاکہ سرکاری کام کاج میں یگانگت اور بہتری لائی جاسکے۔ مورخین نے بالعموم ان دو عمل کو ایک دوسرے کا لازم وملزوم سمجھا اور یہ باور کرلیا کہ ۱۵۸۰ء کی دہائی سے مغل دربار میں فارسی کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی علوم کے ماہرین نے عام طور پر مغلیہ خاندان کو جہان فارسی تک محدود کردیا، جس میں کچھ حد تک دوسری اسلامی زبانیں مثلاً عربی اور ترکی کا بھی رواج تھا۔ دانشوروں نے تقریباً بیک آواز مغلیہ سلطنت کی سیاسی، فکری وفنی، اور ادبی سرگرمیوں کے ضمن میں سنسکرت ادب کی گرانقدر حیثیت کو نظر انداز کردیا، جو ہندوستان کی کلاسیکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ مورخین کے اس رویہ نے بہت دنوں تک سنسکرت کی ثقافتی روایت سے مغلیہ خاندان کے دیرینہ رشتے کو پردہ خفا میں رکھا اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا کثیر ثقافتی (Multiculturalism) پہلو لوگوں سے پوشیدہ رہا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب مغلوں نے فارسی کو انتظامی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا، حکمران طبقہ کے سربرآوردہ افراد نے سنسکرت ادبا، اہل علم اور سنسکرت کتابوں سے اپنا رشتہ بدستور قائم رکھا۔ ۱۵۶۰ء اور ۱۵۷۰ء کی دہائی میں پورے برصغیر سے سنسکرت دانشور مغل دربار میں داخل ہوئے، ۱۵۸۰ء کی دہائی تک جین اور برہمن مفکرین کی ایک بڑی تعداد مغل دربار کا حصہ بن چکی تھی۔ مغلوں نے ان دونوں جماعتوں کے دانشوروں کو اعزازات سے نوازا۔ سنسکرت کتابوں کی تدوین واشاعت کے لئے بے مثال حد تک تعاون کیا اس کے ساتھ ساتھ، شاہی فرمان کے مطابق، دربار میں موجود اہل علم نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور سنسکرت علوم کے تئیں اپنے تاثرات اور خیالات بھی آزادانہ طور پر قلم بند کئے۔ سنسکرت زبان کی بابت مغلوں کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مقامی حکمران اور دوسری جماعتوں نے بھی سربراہان سلطنت مغلیہ کی شان میں قصیدے لکھوائے اور دربار میں سنسکرت دانشوروں کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ یہ

سر گرمیاں جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی جاری رہیں اور ۱۷ ویں صدی کے وسط تک باقی رہیں، چنانچہ اس طرح سنسکرت زبان اور اس کی ادبی روایات فارسی کے شانہ بہ شانہ مغل دربار میں ترقی پاتی رہی۔

مصنفہ آدرے ترشکے نے دربار مغلیہ میں سنسکرت زبان کے چلن کے حوالے سے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے، جو غالباً اس کتاب کی نظریاتی اساس بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مغل سلطنت شروع سے ہی ایک کثیر لسانی اور کثیر مذہبی ریاست (multi-lingual and multireligious state) تھی۔ چنانچہ مغل حکمرانوں کو فقط فارسی زبان وادب اور مذہب اسلام کی تنگ نظر طرفداری کے حدود میں مقید کرنا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، یہ ذہن نشین رہے کہ سلطنت مغلیہ کے بانی بادشاہ بابر کو فارسی اور ترکی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی، اس نے اپنی سوانح حیات بھی چغتائی ترکی میں لکھی تھی۔ عہد اکبری میں شاہی کتب خانہ میں عربی، کشمیری، ہندی، یونانی، اور دیگر یوروپی زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی کتابیں بھی موجود تھیں۔ حال میں مغلیہ سلطنت پر ہوئی نئی تحقیقات سے بھی مصنفہ کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے تئیں مغلوں کے رویہ کو اجاگر کرتے ہوئے السن بش (Allison Busch) اپنی تحقیق میں واضح کر چکی ہیں کہ مغل دربار میں ہندی ایک ادبی اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی تھی چونکہ بہت کم اہل علم سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے، اس لئے بول چال کی سطح پر غالباً ہندی ہی وہ زبان تھی جو فارسی ادبا اور سنسکرت دانشوروں کے درمیان تبادلہ خیال کا واحد وسیلہ تھی۔

عہد جہانگیری میں سنسکرت زبان وادب کی شاہانہ سرپرستی کی تشریح کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

> جہانگیر نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ اس وقت بھی کروایا جب وہ شہزادہ تھا اور ۱۶۰۵ء میں تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ اس بین الثقافتی سرگرمی سے وابستہ رہا۔ اس نے دربار میں جین اور برہمن دونوں جماعتوں کے دانشوروں کی حوصلہ افزائی کی اور شاہی کتب خانہ میں سنسکرت کتابوں کو جگہ دی، جہانگیر نے اپنے والد بادشاہ اکبر کے حکم کے مطابق چند سنسکرت کتابوں کے ترجمے بھی پڑھے، حتی کہ ایک ترجمہ پر اس نے حاشیہ نویسی بھی کی تھی۔ اس سے حکمران طبقہ میں سنسکرت کتابوں کے استعمال کا پتہ چلتا ہے، جہانگیر جین مذہبی لیڈروں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں بھی شریک ہوتا تھا مگر اختلاف رائے کے سبب مغلیہ سلطنت اور جین سادھوؤں کے درمیان تعلقات ۱۶۱۰ء-۱۶۲۰ء کے دوران کشیدہ ہو گئے تھے، جہانگیر کا درباران

لوگوں کے لئے بھی کشش کا مرکز تھا جو قدیم سنسکرت داستانوں کو از سر نو فارسی زبان میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں بالآخر سنسکرت ایک اہم علمی، ادبی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے مغل دربار سے رخصت ہونے لگی لیکن شروع میں یہ دور بھی بین الثقافتی اکسچینج کا محور تھا۔ جگن ناتھ پنڈت راج اور کویندر آچاریہ سرسوتی، جو ۱۷ویں صدی کی مشہور ترین اور بااثر سنسکرت شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے، شاہجہاں کے ان سے اچھے تعلقات تھے۔ جگن ناتھ پنڈت پرانے درباری تھے اور کئی دہائیوں سے مغلوں کی سرپرستی میں سنسکرت کتابیں لکھ رہے تھے، کویندر آچاریہ کے شاہجہاں سے کس طرح کے تعلقات تھے اس کی مکمل تفصیل معلوم نہیں، البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کی ہندوؤں پر لاگو ایک زیارتی ٹیکس کو ختم کروانے میں وہ کامیاب رہے تھے ان کو درباری وظیفہ بھی ملتا تھا۔

سترہویں صدی کے دوسرے نصف سے سنسکرت زبان کو وہ شاہانہ سرپرستی نہیں حاصل رہی جو عہد اکبری سے عہد شاہجہانی تک مجموعی طور پر اس کو میسر تھی۔ اس تاریخی تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے آدرے ترشکے رقمطراز ہیں:

مغلیہ سلطنت کے ایک اہم ثقافتی عنصر کی حیثیت سے سنسکرت زبان کی زوال پذیری کے دو اسباب تھے، ایک لسانی اور دوسرے سیاسی، اول یہ کہ ہندی ایک ادبی زبان کے طور پر ۱۷ویں صدی میں خوب ترقی کر رہی تھی اور بڑی تیزی سے ثقافتی اور تہذیبی میدان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہی تھی جس پر کل تک صرف سنسکرت کا قبضہ تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندی اچانک عہد شاہجہانی کے دور آخر میں ظاہر ہوئی تھی، بلکہ یہ اکبر کے عہد سے ہی مغل دربار میں فکری اور ادبی تخلیقات کا سرگرم وسیلہ تھی۔ مگر ۱۷ویں صدی کے وسط سے ہندوستانی ادب کی ایک کثیر تعداد علاقائی زبانوں سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے لگی تھی۔ اس تبدیلی کے پیش نظر مغل حکمرانوں نے بھی قدیم ہندوستانی علوم کی معرفت کے لئے سنسکرت ادب سے نظریں پھیر لیں اور ہندی پر توجہ مبذول کی۔ مغلیہ شاہی خاندان اور طبقۂ امراء دونوں نے ۱۷ویں صدی کے دوسرے نصف سے ہندی شعرا اور موسیقاروں کی سرپرستی شروع کر دی، جبکہ ۱۶۵۰ء کے بعد سے ہی وہ سنسکرت دانشوروں کو کسی بھی طرح کی مستقل حمایت دینے سے باز آچکے تھے۔

وہیں جب ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر تخت شاہی پر قابض ہوا، تو اس نے مغل دربار اور سنسکرت ادبا و اہل علم کے درمیان بچے کھچے رشتے بھی ختم کر دیے، بظاہر یہ فیصلہ اورنگ زیب کی اس تصویر کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے جو ایک متعصب اور ظالم بادشاہ کی شکل میں عام طور پر

لوگوں کے ذہن میں گھر کر چکی ہے۔ حالانکہ یہ اورنگزیب کی طرف سے ایک سوچا سمجھا سیاسی قدم تھا۔ اورنگ زیب شاہجہاں کا تیسرا بیٹا تھا، جو اپنے بڑے بھائی اور ولی عہد سلطنت دارا شکوہ کو شکست دے کر تخت شاہی پر بیٹھا تھا، ۱۶۴۰ء اور ۱۶۵۰ء کی دو دہائیوں میں دارا شکوہ نے قابل رشک حد تک بین الثقافتی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی تھی، جن میں کچھ چنندہ اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ اور مجمع البحرین نامی وہ رسالہ بھی شامل تھا جس میں دارا شکوہ نے ہندو اور مسلم تصورات کے مابین ہم آہنگی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی......اورنگ زیب کے نظریے کی رو سے یہ قدم اس لئے اہم تھا کیوں کہ وہ سنسکرت سے ہر طرح کے شاہانہ رشتے کو منقطع کر کے اپنے بڑے بھائی کی تہذیبی وراثت سے اپنی ثقافتی روایت کو ممتاز کرنا چاہتا تھا۔

یہ کتاب اسکالرز، طلباء اور ان تمام لوگوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں جو ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے ایک نئے پہلو سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ یہ کتاب عہد وسطی کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری، علم دوستی، اور ہندوستان کی دیرینہ روایات سے والہانہ شیفتگی کی سچی داستان ہے۔

اخبار علمیہ

''مسٹری آف ٹائم ٹریول''

سائنس کی یہ مشہور کتاب ،ڈھاکہ ،بنگلہ دیش سے شائع ہوئی ہے۔سائنس رپورٹر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر مہروان نے اس پر تبصرہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب وقت کے سفر کی پیچیدگیوں کو بہت آسان لفظوں میں پیش کرتی ہے۔ پیچیدہ خیالات کو سلیس زبان اور دلنشین اسلوب میں پیش کرنے میں مصنف عبید الرحمن کافی حد تک کامیاب ہیں۔ کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔پہلے باب میں ٹائم ٹریول کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں مصنف بتاتے ہیں کہ یہ نظریہ وخیال نہ صرف سائنس دانوں بلکہ ہر ایک کو کیوں پسند ہے۔؟مصنف اپنی گفتگو میں سائنس، فکشن، جیومیٹری اور یوکلیڈن اسپیس جیسے تصورات کی مدد لیتا ہے۔دوسرے باب میں مصنف وقت کے سفر کے متعلق مختلف کہانیوں کے بارے میں بحث کرتا ہے اور ۲۰۷ عیسوی میں اس کے متعلق جو نظریات پائے جاتے تھے ان کی تحقیق اور چھان بین کرتا ہے۔اس کے علاوہ دنیا کے مختلف حصوں کی کہانیوں اور رزمیہ نظموں میں ٹائم ٹریول کے نظریہ اور تاریخی واقعات سے آگاہ کرتا ہے۔یہ ایک عمدہ تحقیقی بحث ہے جس میں وقت کے سفر کے تصور اور دنیا کے مختلف خطوں میں کہانی سنانے میں اس (وقت) کے استعمال کے ساتھ ساتھ انسانوں کی دلچسپیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں وقت کے تصور کو فلسفیانہ اور سائنسی انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔اس میں آئن اسٹائن اور دوسرے سائنس دانوں پلانک (Plank)، بروگلی (Brogli)، بوہر (Bohr) وغیرہ کے کام کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس نظریہ کے بارے میں بعض جدید سائنسی نظریات پر بھی مختصراً گفتگو ہے۔یہ نظریہ بنیادی طور پر کئی تضادات کا حامل ہے۔مصنف نے الگ باب میں اس سے بھی بحث کی ہے۔آخری باب اس نظریہ کے مستقبل اور امکانات کے بارے میں ہے۔ورم ہول، کشش ثقل، بلیک ہول اور دیگر تصورات اور پیچیدہ اصطلاحات کو سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔یہ ان قارئین کے لیے معلومات کا ایک خزانہ ہے جو ٹائم ٹریول کے نظریہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ (سائنس رپورٹر، دسمبر ۲۰۲۰، نئی دہلی ص ۵۳)

۵۰ ہزار سالوں میں پہلی بار ایک دمدار سیارہ زمین سے گذرے گا

ماہرین فلکیات نے کہا ہے کہ ایک نیا دریافت ہونے والا دمدار سیارہ کھلی نظروں سے دکھائی دے سکتا

ہے۔ کیونکہ یہ پچاس ہزار سالوں میں پہلی بار آئندہ ہفتوں میں زمین کے پاس سے گذرے گا۔ اس دمدار سیارہ کو (CI2022E3(ZIF کہا جاتا ہے اس کو پہلی بار گذشتہ سال مشتری کے پاس سے گذرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ہمارے نظام شمسی کے برفانی راستوں سے سفر کرنے کے بعد یہ ۱۲ جنوری کو سورج کے قریب ہوگا اور یکم فروری کو زمین کے قریب سے گذرے گا۔ کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں فزکس کے پروفیسر تھامس پرنس کے بقول دوربین کے علاوہ کھلی آنکھوں سے بھی اس کا مشاہدہ بہ آسانی کیا جاسکے گا۔ یہ سیارہ اس وقت سب سے زیادہ روشن ہوگا جب وہ زمین کے قریب سے گذرے گا۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی، ۸ جنوری ۲۳ء ص ۱)

گریٹ سالٹ لیک (جھیل) کے غائب ہونے کے امکانات

مغربی خط استوا کے یوٹا (Uta) میں موجود کھارے نمک کی سب سے بڑی جھیل کا وجود خطرے میں ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق اگر امریکہ کے یوٹا میں موجود جھیل کی حفاظت کے لیے جلد اقدامات نہیں کیے گئے تو یہ پانچ سال کے اندر غائب ہو جائے گی۔ اس سے لاکھوں لوگ خشک جھیل کی زہریلی دھول سے متاثر ہوں گے۔ یہ رپورٹ حال ہی میں اس موضوع کے ۳۲ ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم نے دی ہے۔ ان کے مطابق جھیل نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اپنا ۷۳ فیصد پانی اور ۶۰ فیصد سطحی علاقہ کھودیا ہے۔ یہاں کے دس ہزار کیلومیٹر سے زیادہ علاقہ کا احاطہ کرنے کے لیے دستیاب پانی کی ضرورت ہے۔ (ہندی روزنامہ ہندوستان، وارانسی، ۱۴ جنوری ۲۳ء ص ۱۴)

عمدہ ہائیڈریشن (آبیدگی) کا تعلق صحت مند عمر سے ہے

ای میڈیسن میں شائع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ (NIH) کے ایک مطالعہ کے مطابق جو بالغ افراد ہائیڈریٹ رہتے ہیں یعنی جن کے جسم میں پانی یا رطوبت کی کمی نہیں ہوتی اور اشیائے خوردونوش میں سیال چیزوں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں وہ صحت مند ہوتے ہیں اور دل اور پھیپھڑوں کی مزمن بیماریاں ان میں کم ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے مقابلہ میں ان کی زندگی زیادہ دیرپا ہوتی ہے جنہیں کافی مقدار میں سیال نہیں ملتا۔ ۳۰ سال سے زیادہ عمر کے ۱۱۲۵۵ افراد سے جمع کیے گئے صحت کے اعداد و شمار کا استعمال کیا گیا اور محققین نے سیرم، سوڈیم کی سطح کے درمیان روابط کا تجزیہ کیا، اس کے نتائج یہ بتاتے ہیں کہ مناسب ہائیڈریشن (یعنی جسم میں رطوبت یا پانی کی کمی کا نہ ہونے دینا) صحت مند عمر میں اضافہ اور بیماری سے محفوظ زندگی فراہم کرسکتا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، ۱۵ جنوری ۲۳ء ص ۱۸) ک، ص اصلاحی

آثار علمیہ وتاریخیہ

حیات سعدی اور مولانا حالی

(علامہ شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی نے سر سید کی سوانح ''حیات جاوید'' کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی کہہ دیا تھا تو تحریک علی گڑھ کے بعض نام نہاد ہم نواؤں نے بڑا واویلا مچایا اور علامہ شبلی پر طعن و تشنیع کا بازار گرم کر دیا۔ حتی کہ انہیں علی گڑھ تحریک ہی کا سرے سے مخالف قرار دے دیا۔ بعد میں مہدی حسن افادی نے ''حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک'' لکھ کر اسے مزید ہوا دے دی۔ حالانکہ بقول پروفیسر آل احمد سرور (۱۹۱۱۔۲۰۰۲ء) معاملہ محض اتنا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کو مصور پسند تھا، اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی[1]۔

علامہ شبلی نے ''حیات جاوید'' پر تبصرے سے بہت پہلے اپریل ۱۸۸۶ء حیات سعدی پر ایک عمدہ تبصرہ لکھا تھا جس میں حیات سعدی کی عظمت کا اعتراف بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں تقریباً ہر مبصر اور مضمون نگار نے حیات جاوید پر علامہ شبلی کے نقد کا ذکر کیا ہے لیکن حیات سعدی پر ان کی رائے سے چشم پوشی کی ہے۔ غالباً پروفیسر آل احمد سرور کے سوا اس کا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حیات سعدی کے متعدد ایڈیشن اور محقق ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، مگر علامہ کے تبصرے کا ذکر کسی ایڈیشن میں نہیں ہے۔ حیات سعدی کا ایک محقق ایڈیشن دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے بھی شبلی صدی مطبوعات کے تحت جنوری ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے محقق اور حاشیہ نگار نے بھی اس تبصرے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ راقم برسوں سے اس مضمون کی تلاش میں تھا۔ اللہ بھلا کرے، ہمارے محقق دوست اور مشفق کرم فرما ڈاکٹر عطا خورشید کا جنہوں نے اس قیمتی تحریر کو تلاش کر کے بھیجا۔ وہی نادر تحریر یہاں پیش

---

[1] مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۴

کی جارہی ہے۔ یقین ہے اس نادر تحریر کی اشاعت کے بعد حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک سے لطف لینے والوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئے گی:

مولانا حالی سے ملک کو اب تک اگر یہ شکایت تھی کہ ان کا ابر کرم ایک ہی سمت برس کر رہ گیا۔ یعنی ان کی جادو بیانی صرف نظم اردو پر محدود رہی تو ''حیات سعدی'' نے یہ شکایت بھی رفع کر دی۔ اب نثر اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا حالی کی نگاہ التفات نے ادھر بھی رخ کیا۔

ملک کے جو نامور مصنف اردو زبان میں معلومات سود مند کا ذخیرہ مہیا کر رہے ہیں ان میں مولوی حالی صاحب کا قدم سب سے آگے ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سعدی ایسے شخص کی لائف سیکڑوں دلچسپ اور پر مزہ واقعات سے معمور ہو گی مگر افسوس ہے کہ مصنف کو جو کچھ اس خزانہ سے ہاتھ آیا وہ من میں چھٹانک بھی نہیں۔ مصنف کا یہ عذر بالکل صحیح ہے کہ جن تصنیفات سے اس کو مدد ملنے کی امید تھی وہ آپ کم مایہ تھیں۔ ع

جس دریا سے اس نے چشمہ نکالا وہ خود پایاب تھا۔

ادھر مصنف کو یہ بھی منظور تھا کہ وہ کوئی بات تاریخی سند کے بغیر زبان سے نہ نکالے ورنہ اگر ''آب حیات'' کے مصنف کی طرح وہ بھی بازاری قصوں کو آب ورنگ دے کر لکھنا چاہتا تو مضمون کی تعداد بہت کچھ بڑھا دیتا جس کے ساتھ عوام سے اس کو حسن قبول کی سند بھی مل جاتی۔

غرض لائف کے متعلق تو مصنف کو حسرت کے ساتھ انہی پہلے تذکروں اور تصنیفوں کا دست نگر رہنا پڑا جن کے دامن میں چند خزف ریزوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جہاں شیخ کی تصنیفات اور اس کی شاعری کے متعلق نکتہ سنجی کی ہے وہ مصنف کی طباعی اور سخندانی کا مشہور اور نامور میدان ہے۔

کس موشگافی سے اس نے دکھایا ہے کہ سعدی کا کام نیچرل خوبیوں کے لحاظ سے کس قدر اپنی ہم سر تصنیفات سے ممتاز ہے۔ واقعی جن محفلوں میں صراحی کے قہقہہ اور قلقل مینا کے سوا اور کوئی صدا نہ بلند ہو وہاں وعظ وپند کے سوکھے فقرے سنا کر اہل بزم کو اپنی طرف کھینچنا سعدی ہی کی سحر طرازی اور اعجاز بیانی کا اثر ہے۔

مولانا حالی ہی نے لوگوں کو یہ خیال دلایا کہ جس زمانہ میں دنیا شخصی حکومتوں کے قبضہ میں آزادی کا سبق بھول چکی تھی اس وقت بھی سعدی ایسے حق پرست موجود تھے جو آزادی پر جان دیتے تھے اور جن کی نظیر آج بھی بمشکل مل سکتی ہے۔ ناظرین شاید بعض باتوں میں مصنف سے الجھیں۔ مثلاً اس بات میں کہ انہوں نے جب سعدی کی ایک ایک بات کی حمایت کی تو اس حکایت کا ''قضارا من و پیرے

از فاریاب‘‘ جس میں ایک سپر نیچرل واقعہ کا ذکر ہے کیا جواب دیں گے یا نظامی کے مقابلہ میں سعدی کے رزمیہ اشعار پیش کرنے یا پانچویں باب گلستاں کی بعض فحش حکایتوں کے ذکر سے چشم پوشی کرنے یا واقعہ سومنات کی زبردستی تاویل کرنے اور اس قسم کی بعض باتیں۔ مگر حق یہ ہے کہ اس قسم کی رائیں اجتہادات میں شامل ہیں جس میں ہم کسی مجتہد کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔ اس کے علاوہ کسی پر فضا باغ کی خوبی اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی کہ جہاں اس میں ہزاروں خوشنما پھول ہیں وہاں دو ایک خار بھی ہیں۔

شبلی

۱۹ اپریل ۱۸۸۶ء

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۴ اپریل ۱۸۸۶ء)

خطوط بہ نام مولانا سید ریاست علی ندوی

اہل علم کے یہ مکاتیب مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کے علمی متروکات کے صندوق میں تھے۔ ناظم دارالمصنفین کے ایماپر گاہے گاہے قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

ک ص۔ اصلاحی

P.O.Bankipore, Patna

۲۰/دسمبر ۱۹۴۳ء

مکرمی تسلیم

اس بات سے تو یقیناً آپکو مسرت ہوگی کہ صوبہ بہار کی جیسی شوریدہ سرزمین میں ایک اردو روزانہ کامیابی سے جاری ہے۔ صدائے عام پہلا اردو روزنامہ ہے جو کامیابی کے ساتھ تقریباً دو سال سے نکل رہا ہے۔ اردو صحافت میں بہار بہت پیچھے رہا ہے۔ جس کا تجربہ آپ کو بذات خاص کافی ہے۔ صدائے عام صوبہ بہار کی غیر محفوظ اقلیت یعنی نصف کڑور مسلمانوں کا واحد ترجمان ہے۔ جو پوری طرح آزاد ہے۔ اور ہر قیمت پر قوم وملک کی خدمت کے لیے تیار ہے۔ دو سال کی قلیل مدت میں اس نے کافی کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس پر کسی شخص کا ذاتی اثر اور دباؤ نہیں۔ یہ حق کا حامی ہے۔ لیکن اس کی آئندہ ترقی کے لیے قوم کی ہمدردانہ توجہ ضروری اور لازمی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ آپ نے ندیم کے کام کے لیے ایک پریس خرید کیا تھا۔ جس سے غالباً کام نہ لیا جا سکا۔ اور وہ بھی بیکار پڑا ہوا ہے۔ صدائے عام کا اپنا پریس نہیں۔ اسلیے اسکی ترقی کی راہ میں کچھ دقت حائل ہے۔ پریس کی موجودگی اخبار کی ترقی کی راہ میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ اگر آپ از راہ مہربانی اپنی خرید کردہ

قیمت پر پریس صدائے عام کو مرحمت فرماتے تو عین قومی خدمت ہوتی۔ صدائے عام پر آپکی یہ مہربانی ادب اردو اور مسلمانان بہار کو بھی مرہون منت بنائے گی۔ امید ہے کہ آپ قومی فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے صدائے عام کو وہ پریس دیکر صوبہ بہار میں اردو صحافت کی آبیاری فرمائینگے۔ فقط

والسلام

سید نظیر حیدر

نمبر ۲ زین العابدین روڈ علی گڑھ

۲۶/اکتوبر ۵۰ء

برادر محترم زاد مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ آپ اور بچے وغیرہ سب بفضلہ بخیریت ہوں گے۔

یہ عریضہ ایک خاص ضرورت سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ وسیم بھائی (قاضی وسیم الحق صاحب) آپ کو یاد ہوں گے۔ گذشتہ سال جب آپ علی گڑھ تشریف لائے تھے تو میرے مکان پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یہاں آٹھ دس سال سے طبیہ کالج میں عربی ٹیچر ہیں۔ اس سے قبل مدرسہ چشمۂ رحمت، غازیپور اور دوسرے عربی مدارس میں تعلیم دے چکے ہیں۔ ان کا تعلیمی تجربہ ایک ربع صدی کا ہے۔ عربی اور فارسی کے امتحانوں کی اعلیٰ اسناد یہی کہتے ہیں۔ غرض ایک ممتحن کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود ہیں۔ آپ خدا کے فضل سے ایک مستند کالج کے پرنسپل ہیں اور کالج کے امتحانوں کے لیے ممتحنوں کا تقرر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ وسیم بھائی کو بھی کوئی پرچہ دیجیے مگر اس کا خیال رکھئے گا کہ پرچہ ایسا ہو جس میں امیدواروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہو اور معاوضہ کی رقم کافی ہو۔ اصلی غرض ممتحن کا اعزاز نہیں بلکہ روپئے ہیں۔

میں نے بہت بے تکلفی سے یہ درخواست پیش کر دی ہے۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ امید ہے کہ آپ اسے قبول فرما کر مجھے اور زیادہ ممنون کریں گے۔

بچوں کو دعا کہئے گا۔ آں محترم کی خدمت میں تسلیم عرض ہے۔ نیاز مند

عزیر[۱]

---

[۱]۔ سابق رفیق دارالمصنفین و مصنف تاریخ دولت عثمانیہ۔ اس زمانہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر تھے۔ ک، ص اصلاحی

گورنمنٹ کالج لاہور

مؤرخہ ۶/مئی ۱۹۵۱ء

مکرم بندہ جناب سید ریاست علی صاحب ندوی دام فضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

چند دن ہوئے منیجر صاحب دارالمصنّفین کی طرف سے تاریخ اندلس کا پہلا حصہ موصول ہو کر کمال مسرت و ممنونیت کا موجب ہوا۔آپ کی عنایات بے غایات کا یہ علمی تحفہ ایک مزید ثبوت ہے۔ بہر حال آپ کی گرامی توجہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس اہم اور مفید علمی کام کو سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمادے۔تاکہ باقی مجلدات[۲] بھی اسی خوبی کے ساتھ شائع ہو کر شائقین کی متجسس اور مشتاق نگاہوں کو شاد کام کریں۔مسٹر عبدالماجد صاحب اور دیگر احباب سے آپ کی تازہ علمی فتوح کا ذکر ہوا، تمام اہل نظر نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور آپ کی محنت اور تاریخی بصیرت کی داد دی ہے۔قبلہ سید سلیمان صاحب پچھلے دنوں لاہور تشریف لائے تھے،ان سے اس کا تذکرہ ہوا۔اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے اسے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

اس سے پیشتر بھی علامہ المقری کی ''ازہار الریاض فی اخبار عیاض'' کا آپ سے ذکر کرچکا ہوں۔جس میں المغرب کے متعلق بہت کچھ معلومات موجود ہیں۔غالباً آپ کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور سورتی کے یہاں سے مل سکتی ہیں۔ملاحظہ ہو ان کی تازہ فہرست کتب ''الجواہر''،صفحہ ۱۴۱۔درمیانی کالم قیمت مجموعی پچیس روپیہ ہے۔

انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام (مطبوعہ لائڈن) میں اندلس کے امراء،ولاۃ،رجال اور فضلاء اور ان کے علاوہ تاریخی مقامات پر بہت سے articles موجود ہیں۔چنانچہ اندلس کے تاریخی جغرافیہ کے مؤلف نے ان سے خوب استفادہ کیا ہے۔بلکہ بعض جگہ ان کا محض ترجمہ دے دیا ہے۔اس جغرافیہ کا سن اشاعت ۱۹۲۷ء ہے۔جب کہ انسائیکلوپیڈیا کا صرف نصف حصہ شائع ہوا تھا۔اس لیے مؤلف موصوف آخری حصے کو استعمال نہ کر سکے۔ان میں کے اکثر آرٹکل پروفیسر لیوی پراونسال Levi Provencal کی قلم سے ہیں جو تاریخ اندلس پر سند ہیں۔

صوفی غلام مصطفی صاحب تبسم اور مسٹر عبدالماجد صاحب سلام شوق لکھواتے ہیں۔اپنی خیریت

---

[۲] اب الحمد للہ باقی جلدیں بھی چھپ کر دست یاب ہیں۔ک،ص اصلاحی

وعافیت سے گاہے گاہے اطلاع دیتے رہیں۔

راقم
مخلص دیرینہ
عنایت اللہ

Punjab Export Corrn Ltd
Post Box no 20
Chandigarh (Punjab)

۱۹۶۶/۵/۲۵

محترمی بزرگوار سلام علیکم

تسلیمات عرض ہے۔ آپ کا ۹/ مئی کا مکتوب گرامی مجھے آج ٹور سے واپس آنے پر ملا ہے۔ تاخیر کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

بہتر ہوگا کہ آپ جناب چھاگلا صاحب سے دھلی جاکر ملیں تاکہ منسٹری آف ایجوکیشن میں ایڈوائزر کی حیثیت سے آپ کو جگہ مل سکے۔ منسٹری میں عربک اور پرشین کیلیے کافی پوسٹیں بنائی گئی تھیں اور آپ جیسی تجربہ کار ہستی کیلیے مجھے امید ہے ضرور وہ کچھ نہ کچھ کریں گے۔

مایوسی زندگی کا اہم جزو ہے لیکن مایوسی دیرپا شے نہیں ہے۔ قدم بقدم مسرت بھی اتنا ہی اہم جزو ہے۔ میں تو آپ کی شخصیت کے سامنے بہت ناچیز ہوں میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ لیکن میری ناچیز رائے میں آپ اگر دھلی جائیں تو اگلے سال کی الیکشن تک کیلیے ضرور چھاگلا صاحب کی منسٹری یا انفارمیشن منسٹری کیلیے ۶ یا آٹھ ماہ کے کنٹریکٹ کی کوشش کریں۔ خدا آپ کو کامیابی دے گا۔ آمین

امجد میرے لیے ایک عزیز ترین نقطۂ زندگی بن گیا ہے۔ خدا اسے عمر دراز دے۔ میں نے اسے صلاح دی تھی کہ IJPPTC میں تعلیم مکمل کر کے مجھے ملے کیونکہ میں اسے پلول یا فرید آباد میں کچھ کام کروادینا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے بتلایا تھا کہ کام شروع کرنے کیلیے آپ نے کچھ رقم اس کے لئے مخصوص رکھی ہوئی ہے۔ مجھے خیال ہے کہ وہ کم سے کم دس ہزار لگا کر پلول فرید آباد میں بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا۔ مجھے عین مسرت ہوگی اگر آپ کے نیاز حاصل ہو جائے۔ میں ۲۸ مئی کو دھلی ہوں گا اور اس کے بعد تین جون کو اگر آپ دھلی کا پروگرام بنا چکے ہوں تو مجھے اطلاع دیجئے گا۔ میں دھلی حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

یہ درست ہے کہ آپ فرصت میں اپنی کتابوں کے مسودے سنوار سکنے میں مکمل کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ دھلی میں کسی منسٹری میں کام شروع کر کے دھلی والوں سے رابطہ اتحاد قائم رکھیں تاکہ اگلے سال ہم آپ کو راجیہ سبھا میں دیکھ سکیں۔ جواب کی تاخیر کے لیے پھر معافی چاہتا ہوں۔ جسے آپ طویل خط کہتے ہیں وہ میرے لیے از حد مسرت کا باعث ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ مجھے ایسی

مسرت ہمیشہ عنایت کرتے رہا کریں۔ نیاز آگیں ایس۔ایس ملک

مجمع المحاسن و الفضائل مد فیوضہم[۳]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آنمکرم کی خدمت اقدس میں بصد عجز ونیاز عرض ہے کہ حسب ذیل سؤال کا جواب شافی وکافی بسط وتفصیل کیساتھ مرحمت فرمادیں۔ شاکر ہوں گا۔

زید کہتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت کی رو سے خلیفۂ وقت مجلس شوریٰ کی اکثریت یا کل کی رائے کا پابند نہیں ہے۔ یعنی خلیفۂ وقت ہر معاملہ میں اور ہر حالت میں ہمیشہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے ماننے اور قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ اسکو اختیار ہے کہ کسی معاملہ میں مجلس شوریٰ کی اقلیت کی رائے کو رد کردے جب کہ مجلس شوریٰ کی اقلیت کی رائے پر اسکو اطمئنان اور شرح صدر حاصل ہو جاوے۔ اور اس کے استدلال میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس فعل کو پیش کرتا ہے جو آپ نے منکرین زکوٰۃ واہل ردہ کے معاملہ میں اختیار فرمایا تھا۔ ونیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس فعل کو بھی پیش کرتا ہے کہ باوجود اکابرین صحابہ کے منع کرنے کے حضرت علیؓ قبل جنگ جمل سفر عراق سے باز نہ رہے اور آپ عراق تشریف لے گئے۔ اور معترض کے اس اعتراض کا کہ جب خلیفۂ وقت مجلس شوریٰ کی اکثریت کا پابند نہیں ھے تو مجلس شوریٰ کے انعقاد کی کیا غرض ہے جواب یہ دیتا ھے کہ اسکے انعقاد کی غرض یہ ہے / چونکہ شخص واحد کا دماغ کسی ایک معاملہ کے تمام پہلو اور اسکے جملہ اطراف وجوانب کو محیط نہیں ہو سکتا ھے اور مجلس شوریٰ کے انعقاد کے بعد ارا کین مجلس شوریٰ کے فرداً فرداً مشورہ کے بعد تمام پہلو اجاگر ہو جاوینگے۔ اور خلیفۂ وقت کو کسی ایک رائے کے قائم کرنے میں سہولت ہو جاویگی۔ اور معترض کے دوسرے اعتراض کا کہ ان ہر دو خلفاء راشدین کے واقعہ میں مجلس شوریٰ کا انعقاد ہی نہیں ہوا۔ یہ کہا جاسکے حضرت صدیقؓ نے مجلس شوریٰ کی رائے کو رد کردیا یہ جواب دیتا ہے کہ مجلس شوریٰ کا یہ تصور اور یہ نظام جو آج پایا جاتا ہے۔ یہ اسوقت نہ تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے آیا زید کا یہ قول کہ خلیفۂ وقت مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے ماننے پر ہر معاملہ اور ہر حالت میں مجبور نہیں ھے۔ صحیح ہو یا غلط۔ امید ھے کہ دلنشین دلائل کے ساتھ جناب والا ہی اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ فقط والسلام

نیاز آگیں شاہ ابوالقاسم غفرلہ از ڈاکخانہ وقصبہ بحری آباد، ضلع غازیپور

---

[۳] اس خط پر تاریخ اور سنہ درج نہیں ہے۔ ک، ص اصلاحی

تبصرۂ کتب

عجائب القرآن: از مولانا سید جاوید احمد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت مجلد، صفحات ۵۶۰، قیمت درج نہیں، پتہ: ندوی بک ڈپو ندوۃ العلما، لکھنؤ اور لکھنؤ کے دیگر مکتبے، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، موبائل: ۸۳۰۳۰۱۷۷۷۲

قرآن مجید کے معانی و مطالب کے لیے وسعت، عظمت، گہرائی و گیرائی جیسے الفاظ کے تمام معنوی امکانات موجودات بن جائیں تو بھی ان کی نسبت سمندر سے قطرے ہی کی ہو گی، فصاحت و بلاغت، لفظ و صوت، علم و تحقیق، دعوت و تبلیغ، تاریخیت اور نفسیات جیسے کتابی علوم و فنون پر وقت کے لحاظ سے قرآن مجید کی یکتائی اور برتری کا اقرار کراتی رہی ہے، جو اس کے زندہ جاوید ہونے کا زمانی ثبوت بھی ہے، وقت کی رفتار اور اس کے تغیر پذیر مزاج نے کبھی قرآنی مضامین کو اوراق کہنہ و پارینہ بتانے یا سمجھنے کا خفیف ترین اشارہ تک نہیں کیا، یہ واقعی معجزۃ اللہ الخالدہ کا اعلان ہے، کہ جب تک انسان دنیوی زندگی کی ایک اجل مسمی سے مشروط ہے، قرآن مجید کی حفاظت و بقا بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اسی حقیقت کا ادراک علوم قرآنیہ سے تعلق اور شغف رکھنے والوں کے ذریعہ مسلسل ہوتا رہا۔ زیر نظر کتاب کو بھی اسی بات کے اثبات میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ فاضل مصنف پہلے بھی قرآنی موضوعات پر فکر انگیز تحریریں پیش کر چکے ہیں، کتاب کے لکھنے کی وجہ ان کے نزدیک موجودہ سائنسی دور اور اس کی تحقیقات و انکشافات ہیں، جن سے علم و یقین کی دنیا میں وہ فضا بھی راس آتی ہے جو ایمان بالغیب کی بہت سی باتوں کو ایمان بالشہود سے بدل سکتی ہے، یہ خیال جتنا فطری ہے اتنا ہی سوالات پیدا کرنے والا بھی ہے، مثلاً یہی کہ کیا قرآن سائنس و فلسفہ کی کتاب ہے؟ مصنف کے سامنے سب سے پہلے یہی سوال آیا اور پھر پوری کتاب اسی سوال کا جواب بنتی چلی گئی، نقطہ آغاز بھی خوب تلاش کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایمان کامل کے بعد بھی اطمینان قلب کے لیے کیف تحی الموتی کی فرمائش کر کے ایمان کا رشتہ عقل سے استوار کرنے کی منطقی توجیہ کا جواز حاصل کر لیا اس کے بعد مصنف نے قانون کشش پر بحث کے دوران جس طرح قدیم و جدید مطالعات کو پیش کیا اس سے گویا یہ اعلان کرنا تھا کہ زمین کے محل وقوع، اس کی کرویت اور حرکت کے متعلق قرآنی معلومات کی تصدیق کے لیے علم جدید بھی مجبور ہے، یہ بحث علمائے متقدمین اور مفسرین کے حوالوں سے بھی معمور ہے، اس کے بعد پہاڑ، سورج، چاند، سات زمینوں کا وجود اور کائنات کی تخلیق جیسے مباحث میں قدیم و جدید معلومات سے عقل کا دامن بھر جاتا ہے، آخری بحث باب نہم میں جدید سواریوں کی ایجاد کے تعلق سے ہے، اس طرح قرآنیات اور سائنس

کے موضوع پر اچھی کتابوں میں یہ کتاب بھی شامل ہو گئی ہے، مصنف چوں کہ ایک اچھے معلم بھی ہیں اس لیے کتاب میں خطابت اور زور کلام کا اثر صاف نمایاں ہے۔ موضوع کے تعلق سے مفید تصویریں بھی ہیں، مولانا سید محمد رابع ندوی اور مولانا تقی الدین ندوی کی تعارفی تحریروں سے بھی کتاب کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ پروفیسر انیس چشتی مرحوم کا پیش لفظ ان کی یادوں کو ایک بار پھر زندہ کر گیا، کیا پیارا انداز نگارش ان کو نصیب ہوا تھا۔

جنوب کے اصحاب کمال جلد اول: از ڈاکٹر راہی فدائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۵۲۰، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: الانصار پبلی کیشنز جمال نگر ریاست نگر، حیدر آباد، تلنگانہ، سن اشاعت درج نہیں، موبائل: ۰۹۳۹۱۳۰۱۱۹۲، ای میل: alansarpublications@gmail.com

ڈاکٹر راہی فدائی اس وقت اردو کے ان چند اہل قلم میں ہیں جن کا قلم مسلسل مضامین نو کا انبار لگانے میں مصروف ہے، یہ احساس بجا ہے کہ دکن کی مذہبی ادبی تاریخ کے اردو سرمایہ سے کم اعتنا کیا گیا، اور دکن کی مذہبی ادبی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا، لیکن اس کتاب کے مصنف نے اس کمی کی تلافی جس طرح کی وہ اب محتاج بیان نہیں، ان کی اس غیر معمولی محنت و جستجو کی تہہ میں جو چیز محرک ہوئی وہ بھی دلچسپ ہے، ان کے ایک استاد اور مشہور عالم و مدرس سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری ان سے اکثر کہتے کہ ''جناب جنوب میں جمود ہے، یعنی علم و ادب اور مذہب و سیاست کی ساری تحریکوں کا منبع و مصدر شمال ہے اور یہ جنوب میں فعالیت کے فقدان کی وجہ سے ہے''، بس یہی جملہ ڈاکٹر راہی فدائی کے ذوق تحقیق کے لیے مہمیز بن گیا، جس کے بعد ان کی کتابوں کا ایک لا متناہی سلسلہ جاری ہو گیا، انہوں نے کڈپہ اور ویلور جیسے مقامات کو لکھنؤ اور دہلی کی طرح، عام اردو قاری سے مانوس کر دیا، انہوں نے اس احساس کے ساتھ کہ جنوب کے اصحاب کمال اپنے بے نیازانہ مزاج کی وجہ سے شہرت پسندی اور ناموری سے کوسوں دور تھے، ان ارباب علم و دانش کی ایسی مرقع آرائی کی کہ اب جنوب کو شکوہ کی جگہ شان کے بیان کا حق حاصل ہو گیا، زیر نظر کتاب بس اسی تمہید کی مفصل تشریح ہے جس میں قریب چھبیس اصحاب کمال اور ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں زیادہ تر تحریریں معارف کے صفحات کی زینت میں اضافہ کا سبب ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے خوبصورت بات کہہ دی کہ اس کتاب کو دکن کے گم گشتہ علماء، صوفیہ، شعراء و ادبا کی دینی، اخلاقی، علمی اور ادبی خدمات کا شناخت نامہ کہا جا سکتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ رتن پدم، پھول بن جیسے اردو کے اولین صحیفوں کے ساتھ ولی ویلوری، شاہ جمال قادری، حضرت شہ میر، شاہ نور اللہ قادری، فخر الدین مکری، جامی دکن شاہ کمال، شاہ قربی، شاہ ذوقی، باقر آگاہ اور خاطر

میسوری تک کے احوال صرف ان شخصیات ہی سے نہیں اردو کی زندگی کی اولین ساعتوں اور برکتوں سے ہم کنار کرنے والے ہیں، مصنف کی ایک متعارف خوبی ان کا اسلوب بیان ہے لیکن اس سے بھی زیادہ وہ مستند حوالوں اور اصل مصادر و مآخذ سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت اور خوبی میں ممتاز ہیں۔ اور اس کتاب کے مضامین اسی خوبی کا بہترین نمونہ ہیں۔

نوائے خاموش: از جناب معصوم مراد آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۱۹ء، پتہ: ایم. آر. پبلی کیشنز، ۱۰ میٹرو پول مارکیٹ ۲۵۔۲۴۷۲ فرسٹ فلور کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲ موبائل نمبر: ۰۹۸۱۰۷۸۴۵۴۹ ای میل: abdus26@hotmail.com

دنیا کی بھیڑ میں انسانوں کی تلاش کا مشغلہ روز اول سے ڈھونڈنے والوں کے لیے شاید سب سے زیادہ پسندیدہ رہا ہے۔ تذکرہ، سیر و سوانح، سر گزشت، خود نوشت، خاکہ نگاری، ذاتی ڈائری یعنی قلم و قرطاس کی دنیا کا بیشتر حصہ، اسی تلاش اور پھر کچھ پانے اور کامیاب ہونے کی داستانوں کے لیے خاص ہو گیا، زیر نظر کتاب بھی اسی ازلی داستان گوئی کا ایک حصہ ہے، چراغوں کے بجھنے سے جن لوگوں کو اندھیرے کی ویرانی اور تاریکی پھیلنے اور بڑھنے کا اذیت ناک احساس زیادہ ستاتا ہے، معصوم مراد آبادی کا شمار ان ہی انسانوں میں ہے، شعری، ادبی اور فنی بستیوں میں سناٹوں کی حکمرانی عام اور تام نہ ہو اس کے لیے انہوں نے اردو کے قریب بیس پچیس شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی یادوں کو وہ زبان دی جو بظاہر نوائے خاموش ہے لیکن جو نہ جانے کتنی ساعتوں میں گونجنے کا ہنر بھی رکھتی ہے، کلیم عاجز سے ڈاکٹر محمد حسن تک ہر شخصیت اپنا نام اور مقام رکھتی ہے۔ جون ایلیا، ملک زادہ، مشتاق یوسفی، مشفق خواجہ، سعید سہروردی، فضیل جعفری، ڈاکٹر ہاشم قدوائی، محبوب الرحمن فاروقی، یونس دہلوی، ایف ایم حسین، ٹام آلٹر، ابن صفی، خواجہ احمد عباس وغیرہ الگ الگ دنیا کی حیثیت رکھتے ہیں، فاضل سوانح نگار نے ان دنیاؤں کی جس طرح سیر کی اور ان کی زندگی کے اس سفر کے تماشائی بنے جس میں زندگی محض اسم واحد نہیں، سانسوں کی جمع الجمع ہو جاتی ہے، یہ واقعی دوسروں کو تماشابین بنانے میں پوری طرح کامیابی کا اظہار ہے، جناب معصوم باکمال صحافی ہیں اور صحافیوں کی اس صف میں ہیں جن سے اردو ادب عالیہ کی رونق کبھی کم نہیں ہو سکتی، ان کو دیکھ اور پڑھ کے اگر جوہر، ظفر، دریابادی اور حسرت و سالک کی یاد آتی ہے تو یہ محض واہمہ نہیں، حقیقت ہے۔ جس کا قلم اس حقیقت کا اعلان کرے کہ انسان کا ذاتی کردار اس کے فکر و فن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے قلم کی قدر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ نوائے خاموش یقیناً

اس لائق ہے کہ اس کو دل میں اتارا جائے۔ (ع۔ص)

علامہ یوسف القرضاوی: شخصیت اور افکار، ترتیب: شفیق الرحمن اور عبد الحہ اثری فلاحی، المنار پبلشنگ، دہلی، ۲۰۲۲، صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۲۹۰ روپئے۔ ناشر کا ای میل: khalidazmi64@gmail.com

علامہ یوسف القرضاوی عصر حاضر کے ان قلیل علما میں سے ہیں جنہوں نے خالص مذہبی حدود سے نکل کر سماجی، سیاسی اور اجتماعی حدود میں کام کیا جس کے نتیجے میں ان کو قبول عام ملا۔ ان کا ایک خاص کام فقہ کو آسان بنانا (تیسیر) ہے۔ القرضاوی نے اسی نہج پر 'الحلال والحرام فی الاسلام' نامی کتاب ۱۹۵۹ میں لکھی جس کا تقریباً بیس زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب دینا بھر میں ان کی پہچان بن گئی۔ اس کتاب میں انھوں نے لوگوں کی زندگی آسان بنانے کا راستہ بنایا ہے اور غیر مذہبی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اسلام کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ موسوعیت، توازن اور روشن خیالی ان کی پہچان ہیں۔ موجودہ کتاب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی زندگی اور علمی و دعوتی کاموں پر مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں کچھ اسی کتاب کے لئے لکھے گئے ہیں اور کچھ عربی اور انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی حیات و خدمات، نقوش وتاثرات، افکار و نظریات، نقید و نظر، تصنیف وتالیف، خطاب، نصیحت اور وصیت، مکاتیب اور تعزیت کے تحت مقالات اور معلومات جمع کی گئی ہیں۔ کتاب ہر وقت اور بڑی حد تک مرحوم کی کچھیر جہتی زندگی اور علمی خدمات کا احاطہ کرتی ہے۔ اردو میں اس کتاب کے بر وقت شائع ہونا خوش آئند ہے۔ مسلمانان ہند اور عالم عرب کے درمیان گہرے تعلقات کے لئے اس طرح کی سر گرمی بہت اچھی ہے۔ (ظ۔اُ۔خ۔)

اقبال اور اورنگ آباد: عنایت علی۔ کاغذو طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۵۵۲، ملنے کا پتہ: شالیمار بک ہاؤس، سٹی چوک، اورنگ آباد۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۸ء۔ موبائل نمبر: ۹۹۷۵۵۴۰۸۴۹۔

غیر منقسم ہندوستان کے جن علاقوں کو علامہ اقبالؒ کے قدوم میمنت لزوم کی باریابی کا شرف حاصل ہے ان میں مہاراشٹر کا معروف و مشہور شہر اورنگ آباد بھی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں اس شہر میں ان کے مختصر قیام کا پتہ چلتا ہے لیکن اور تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ مرتب نے پہلی بار اسے واقعاتی تسلسل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے باب میں اقبال کے دورۂ اورنگ آباد کا پس منظر، محرکات اور دیگر تفصیلات ان کے چند مکتوبات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ دوسرے باب میں اورنگ زیب کے متعلق اقبال کی ایک مختصر انگریزی تحریر مع ترجمہ اور دو فارسی نظمیں مع اردو منظوم ترجمہ شامل ہیں۔ تیسرے

میں شہر اورنگ آباد کی مختصر تاریخ اور گذشتہ ۸۰ برسوں میں اقبال سے متعلق لکھی گئی اہل اورنگ آباد کی نظموں اور مضامین کا ذکر اور مختصر جائزہ ہے۔ چوتھے باب میں وہ تمام مضامین اور نظمیں شامل ہیں جن کا ذکر باب سوم میں کیا گیا ہے اور ۱۹۳۶ سے ۲۰۱۰ تک شائع شدہ ان تمام نظموں اور مضامین کو دو حصوں حصۂ نظم و نثر میں الگ الگ جمع کیا ہے۔ اقبال پر لکھی گئی نظموں میں سکندر علی وجد، غلام علی اور حمایت علی وغیرہ کی نظمیں اور حصہ نثر میں مجلہ نورس، اورنگ آباد اور دیگر رسائل و کتب میں مطبوعہ یعقوب عثمانی، سکندر علی وجد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر عصمت جاوید جیسے مشہور و معروف ارباب قلم کی منتخب تحریریں ہیں۔

اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے میں یہ تمام نظمیں اور مضامین آج بھی ویسے ہی مفید و نفع بخش اور لطف ولذت کے حامل ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ اس لیے کہ بیشتر اوریجنل ہیں۔ مرتب نے اقبالیات اور اہل اورنگ آباد کی خدمات کا جائزہ بڑی باریک بینی سے لیا ہے اور بہت سی نظمیں اور مضامین جو عام اہل علم کی دسترس سے باہر تھے ان کے خوان علم و ادب پر نہایت خوبصورتی سے سجایا ہے۔ اس سے ایک طرف اس شہر میں اقبال کی آمد کا صحیح معنوں میں ثبوت فراہم ہوتا ہے اور دوسری طرف اورنگ آبادی علما، شعرا و ادبا کی اقبال سے عقیدت و محبت اور ایک خاص علاقہ میں اقبالیات پر کاموں کی تحقیق و تفحص سے مرتب کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب میں اقبالیات پر بعض نئی تحقیق اور نئے مواد کی دریافت کے سبب ان کو اقبالیات کے معتبر و مستند محققین میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

نقش معنی: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۵۶۔ ملنے کا پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور۔ 440018 (مہاراشٹر) قیمت: ۱۵۱ روپے۔ سن طباعت: 2019ء۔ موبائل نمبر: ۰۷۲۷۶۰۰۶۳۳۲، ای میل: sahilcomputerngp@gmail.com

زیر تبصرہ کتاب مصنف کے کل ان ۲۱ مضامین کا مجموعہ ہے جو ضرورت کے تحت قلم بند کیے گئے۔ بعض سیمیناروں میں پڑھے گئے اور بیشتر رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ متنوع موضوعات پر ان کے یہ مضامین محنت و تحقیق سے لکھے اور بہت سلیقہ سے جمع کیے گئے ہیں۔ پہلے اردو حمد و مناجات میں ہندوستانی عناصر، اردو نظموں میں تعمیری اور غزلوں میں قومی یکجہتی کے رجحانات تلاش کیے گئے ہیں۔ اردو شاعری میں شطحیات کے عنوان سے مقالہ قابل قدر ہے۔ مصنف شطحیت یعنی اسلامی اصول وعقیدہ کی تحقیر و بے حرمتی کو اسلام کے منافی اور اس کے مرتکب کو گنہگار سمجھتے ہیں۔ اس موضوع پر

اچھا مواد جمع کر دیا ہے۔ قومی یکجہتی میں اردو صحافت کے کردار پر محققانہ و ناقدانہ گفتگو مصنف کی مثبت فکر و نظر کی آئینہ دار ہے۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کو تخلیقی شان کی حامل اور شاعرانہ صناعی کا بہترین نمونہ (ص ۲۹) قرار دینے کے بعد یہ جملہ بھی لکھا ہے کہ زور تخیل اور مضمون و معنیٰ آفرینی کے باعث یہ معمّہ اور چیستاں بن گئی ہے اور اشعار داخلی جذبات واحساسات اور اثر وتاثیر سے محروم ہو گئے ہیں۔ (ص ۳۲) سر سید، حالی، شبلی اور اقبال کے فکری، تحقیقی اور ادبی افکار واسلوب، جگر کی شاعری کے ارتقائی روپ، فن مکتوب نگاری، خطوط کی روشنی میں مشاہیر کی باطنی کیفیت کا تجزیاتی مطالعہ بھی خوب کیا ہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد، شاد اور علامہ اقبال کی باباتاج الدین سے عقیدت، مولانا ناطق کے تنقیدی مزاج، فن شاعری پر سید مبارک علی کی نظر ومہارت، جدید شاعری کے ارتقائی سفر اور ادب اطفال کے فکری زاویوں کا احاطہ بھی دقت نظری سے کیا ہے۔

مصنف کا شمار اردو کے مشہور اور زود نویس محققین وناقدین میں ہوتا ہے۔ درجنوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور صاحبان علم و تحقیق کی نظر میں اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئیں۔ اس مفید اور دلچسپ مجموعۂ مقالات کے لیے مصنف ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

مکاتیب مفکر اسلام بنام سعید الرحمن الاعظمی : سعید الرحمن الاعظمی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۰۰۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۶۹۶۴۳۷۲۸۳، ای میل: درج نہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ایسے لائق وفائق تلامذہ تھے جنہوں نے ان کے علمی، تعلیمی، تحقیقی اور ادبی منصوبوں کی تکمیل میں ان کا بھرپور تعاون کیا، انہیں میں ایک نمایاں نام مولانا سعید الرحمن الاعظمی ندوی کا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے نام مولانا علی میاںؒ اور ضمیمہ کے طور پر بعض دیگر اساتذہ اور بزرگوں مولانا تقی الدینؒ ہلالی مراکشی ۲۔ خط، مولانا شیخ زکریاؒ کاندھلوی ۲۔ خط، مولانا محمد احمدؒ پرتاپ گڑھی ا۔ خط، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ۳۔ خط، ماسٹر محمد سمیع صدیقی ا۔ خط، مولانا قاضی معین اللہ ندوی ا۔ خط، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۹۔ خط وغیرہ اور بعض اقربا والد محترم ۲۔ خط اور بڑے بھائی حکیم عزیز الرحمن ۲۔ خط اور احبا ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی۔ ا خط اور مولانا محمد الحسنی ۶۔ خط کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ مولانا علی میاںؒ کے کل سو خطوط میں ۱۹۵۸ میں لکھا گیا ۱۹واں خط عربی میں ہے۔ باقی سب اردو میں ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا ہلالی صاحب کے دو اور خطوط عربی میں ہیں جو مکناس، مغرب سے انہوں نے مولانا کو لکھے تھے۔ ان تمام عربی خطوط کا اردو میں اگر ترجمہ ہوتا تو اردو

داں طبقہ کے لیے ان سے استفادہ آسان ہو جاتا۔ آخر میں مولانا ہلالی صاحب، مولانا علی میاںؒ، مولانا سید محمد رابع حسنی اور مولانا محمد الحسنی کے خطوط کا عکس بھی شامل کیا ہے۔ بعض ضروری مقامات پر وضاحتی حواشی نے احساس تشنگی کو زائل بھی کیا ہے۔ محترم مکتوب الیہ کا ندوہ میں داخلہ ۱۹۵۲ میں ہوا۔ پہلا خط ۷ مئی ۱۹۵۳ کا ہے۔ خط نمبر ا سے ۷۰ تک بالترتیب خطوط پر سنہ اور تاریخ درج ہے۔ البتہ کسی میں عربی، عیسوی دونوں اور کسی میں صرف ایک سے کام چلایا گیا ہے۔ خط نمبر ۷۱ سے ۹۹ تک سنہ اور تاریخ کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ بیچ میں خط نمبر ۸۷ پر ۵ دسمبر ۷۴ء اور خط نمبر ۱۰۰ پر ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کی تاریخ و سنہ مرقوم ہے تو ترتیب کے لحاظ سے ان کو ان کے اصل مقام پر درج کرنا چاہیے تھا۔

ان خطوط میں مکتوب نگاروں کی مکتوب الیہ سے محبت اور ان سے ذاتی، علمی، ادبی اور شاگردانہ تعلقات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ بالخصوص مولانا علی میاں نے مکتوب الیہ کی جس انداز سے ندوۃ العلما میں داخلہ سے آخر عمر تک مشفقانہ سرپرستی اور علمی و فکری تربیت کے بعد اپنے تصنیفی و تالیفی اور تحقیقی کاموں میں مدد لی، اس کی بہت حد تک تفصیل ان میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں اس قدر مواد آگیا ہے کہ ندوہ کے ایک عہد (عہد علی میاںؒ ندوی) کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی تاریخ مرتب کرنے میں ان سے اچھی خاصی مدد لی جاسکتی ہے۔ (ک ص اصلاحی)

المختارات العربیۃ فی ثوبہ الجدید (مع تدریبات متنوع الاسلوب والمنہج) از: م۔ع۔ سلیم خاں، ترتیب نو: عثمان حسن (البارہ بنکوی)، محمد ہارون (الدہلوی)، عاصم کمال (الاعظمی)، شاہد اقبال (الکان فوری) مکتبۃ اساس اللغۃ، دہلی ۱۱۰۰۰۶، صفحات ۳۹۱، سال اشاعت ۱۴۴۲ھ، خوبصورت گیٹ اپ، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر م۔ع۔ سلیمان خاں (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی تالیف ہے۔ یہ عالم عرب سے شائع ہونے مشہور اخبارات، مجلات اور بعض تاریخی کتب وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ کتاب کا تعارف پیش لفظ میں یوں کرایا گیا ہے: ''مختلف موضوعات پر نصوص منتخب کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے، ساتھ ہی آپ نے عربی نصوص کا انگریزی ترجمہ بھی کر دیا ہے''۔

یہ کتاب ایک زمانے سے دارالعلوم دیوبند میں تکمیلِ ادب کے علاوہ اکثر مدارس میں شامل نصاب ہے۔ اس زمانے میں اس کے محض چند اوراق فوٹو کاپی کی شکل میں موجود تھے۔ آج مذکورہ فاضلین کی محنت سے نئے لباس میں یہ ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں پہلے عربی عبارتیں دی گئی ہیں، پھر ان پر اعراب لگایا گیا ہے۔ اس کے بعد چھ تدریبات دی گئی ہیں۔ پہلی تدریب میں

تعبیرات کو عربی جملوں میں استعمال کیا گیا ہے۔دوسری تدریب میں اردو جملوں کا عربی میں ترجمہ، تیسری میں غیر مرتب الفاظ کو صحیح ترتیب دے کر جملہ بنانے اور ان کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔چوتھی تدریب میں سوالات کے جواب اور پانچویں میں منتخب الفاظ کو مفید جملوں میں استعمال کرنے کا مطالبہ اور آخری تدریب میں سبق کے نص کے مشابہ اردو خبر کا ترجمہ کرنے کو کہا گیا ہے۔ مجموعی لحاظ سے جدید عربی زبان سیکھنے اور سکھانے کے لئے مشق و تمرین کے لحاظ سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ فرعی عنوان یوں ہونا چاہئے تھا: مع تدریبات متنوعۃ الاسلوب والمنھج کیونکہ متنوعۃ تدریبات کی صفت ہے۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

اہل حدیث فضلاء کی قرآنی خدمات: از مولانا رفیق احمد سلفی، ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۹، صفحات: ۲۱٦، قیمت: ۴۰۰ روپے۔

خلیق احمد نظامی سینٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملحق ہے۔قرآنیات سے متعلق موضوعات پر ریسرچ و اشاعت اس کا موضوع ہے۔اس کے موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی ہیں جو قرآن پاک کے انگریزی تراجم پر نظر رکھتے ہیں۔

مذکورہ کتاب اس ادارے کی مطبوعات کا حصہ ہے۔اس میں چند ممتاز اہل حدیث علماء کی تفسیری خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً نواب سید صدیق حسن خان قنوجیؒ، مولانا سید امیر علی ملیح آبادیؒ، مولانا ڈپٹی سید احمد حسن محدث دہلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد حنیف ندویؒ، مولانا عبد الرحمن کیلانیؒ، ڈاکٹر محمد لقمان سلفیؒ، اور مولانا حافظ صلاح الدین یوسفؒ۔

اس سے پہلے بھی اہل حدیث علماء کی تفسیری خدمات کے جائزے پر کئی کتابیں منظر عام آچکی ہیں، جیسے مولانا ابو یحییٰ خاں امام نوشہرویؒ کی ''ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات''، ملک عبدالرشید عراقی کی ''برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی تفسیری خدمات''، مولانا محمد اسحاق بھٹی کی ''علمائے اہل حدیث ہند و پاک کی قرآنی خدمات'' اور ڈاکٹر عبدالرحمن عبدالجبار الفریوائی کی عربی کتاب ''جہود اھل الحدیث فی خدمۃ القرآن الکریم'' وغیرہ۔

زیر تبصرہ کتاب میں اہل حدیث فضلاء کی قرآنی خدمات کے سلسلے میں فاضل مصنف وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس میں تمام قرآنی خدمات کا تعارف پیش کرنے کے بجائے صرف تفسیری خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور وہ بھی صرف اردو زبان کی حد تک۔۔۔۔اسی لیے ہم نے گزشتہ سطور میں مراجع و مصادر کی بعض اہم کتابوں کا تعارف کرا دیا ہے، جن میں تمام علمائے اہل حدیث کی قرآنی خدمات

کااحاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے''۔(ص:۱۴۔۱۵)۔

نواب صدیق حسنؒ کی اردو تفسیر ''ترجمان القرآن بلطائف البیانِ''پر کافی شرح وبسط سے لکھا گیا ہے۔ اس سے قبل اصول تفسیر پر ان کے رسالہ ''الاکسیر فی اصول التفسیر''پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ کتاب اصلاً شاہ ولی اللہ دھلویؒ کی الفوز الکبیر وامام ابن تیمیہؒ کی ''مقدمہ فی اصول التفسیر'' کے افادات و تلخیص پر مشتمل ہے۔(ص:۳۷)۔

مولانا ثناء اللہ امرت سری کی تفسیر کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔اس ضمن میں حروف مقطعات پر ان کے نقطۂ نظر کو ان کے الفاظ ہی میں واضح کیا گیا ہے:

> ان حروف مقطعات کے معنٰی بتلانے میں بہت ہی اختلاف ہوا، جس کا مفصل ذکر تفسیر اتقان اور معالم میں مذکورہ ہے۔میرے نزدیک زیادہ صحیح وہ معنٰی جو ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہر ایک حرف اللہ کے نام اور صفت کا مظہر ہے۔اسی لیے میں نے یہ ترجمہ جسے آپ دیکھ رہے ہیں، کیا ہے۔یہ حضرت عباسؓ سے منقول ہے۔(ص:۱۱۳)

اس کی مثال یہ ہے کہ مولانا امر تسریؒ نے حروف مقطعات سورۃ البقرۃ میں الم کا ترجمہ: ''میں ہوں اللہ بڑے علم والا''اور سورہ یونس میں الر کا ترجمہ: ''میں ہوں اللہ،سب کچھ دیکھتا اور سنتا'' سے کیا ہے (ص:۱۱۳)۔

مجموعی اعتبار سے کتاب معلوماتی اور لائقِ مطالعہ ہے۔البتہ اس میں کہیں کہیں قرآن کی آیات کی کتابت میں غلطی ہوگئی ہے۔ مثلاً ''کتاب انزل الیک فلایکن فی صدرک حرج منہ'' (الاعراف ۲) میں ھرج لکھا ہے۔قرآن پاک کی آیات کے نقل کرنے میں شدت اعتناء کی ضرورت ہے۔ بہتر معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کی آیات کو انٹرنٹ سے کاپی کرکے کمپیوٹر پر اپلوڈ کر لیا جاے اور اسی کو استعمال کیا جائے،تاکہ اس طرح کی غلطیوں سے بچا جاسکے۔

اس کتاب میں آخری مضمون ''تفسیر احسن البیان''از مولانا محمد جونا گڑھیؒ (مترجم)اور مولانا حافظ صلاح الدین یوسفؒ پر ہے، جس پر اختصار سے لکھا گیا ہے، حالانکہ اس پر مزید تفصیل سے لکھا جاسکتا تھا۔

آخر میں بطور اشارہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا شمس پیرزادہ (م:۱۹۹۸ء) کی اہم تفسیر ''دعوت القرآن'' ہے جس کا تذکرہ اس کتاب میں نہیں کیا گیا ہے۔میری تحقیق کے مطابق وہ ایک جید اہل حدیث عالم تھے اور ان کی تفسیر دعوتی نقطۂ نظر سے ایک اہم تفسیر ہے۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

معارف کی ڈاک

تبصرۂ کتب میں سنِ طباعت کا اندراج

جنوری ۲۰۲۲ء سے معارف کے ''تبصرۂ کتب'' کالم میں زیرِ تبصرہ کتابوں کے سنِ طباعت کے اندراج کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اسے اِس ناچیز کے علاوہ دیگر قارئین نے بھی پسند کیا تھا اور یہ توقع ظاہر کی تھی کہ یہ روایت ان شاءاللہ تعالیٰ برقرار رہے گی، لیکن ادھر نومبر ۲۰۲۲ء کے شمارے سے اس میں کچھ خلل آگیا ہے۔ معارف نومبر ۲۰۲۲ء سے جنوری ۲۰۲۳ء تک کے شماروں میں جن زیرِ تبصرہ کتب کا سنِ طباعت درج نہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ نومبر ۲۰۲۲ء، ص ۸۶۹۔ مسلم سائنس داں اور ان کے سائنسی کارنامے، مصنفہ محمد سراج الدین، ۲۔ دسمبر ۲۰۲۲ء، ص ۹۴۵۔ نقوشِ آگہی، وارث ریاضی، ۳۔ دسمبر ۲۰۲۲ء، ص ۹۴۶۔ سبیل العارفین، محمد اویس قاسمی اعظمی، ۴۔ جنوری ۲۰۲۳ء، ص ۷۱۔ قرآن پاک کے منظوم تراجم، رئیس احمد نعمانی، ۵۔ جنوری ۲۰۲۳ء، ص ۷۱۔ دکن سے مغلوں کے تعلقات، سید نصیر احمد، ۶۔ جنوری ۲۰۲۳ء، ص ۷۴ (The Immortals -2- جاوداں شخصیات)، سید نصیر احمد

قارئین کی افادیت کے لیے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ نمبر ۲ کے تحت مندرج کتاب (نقوشِ آگہی) کا سنِ طباعت ۲۰۲۱ء ہے، جیسا کہ معارف اپریل ۲۰۲۲ء کے شمارہ میں ص ۳۲۷ پر ''رسید کتبِ موصولہ'' کے تحت مذکور اس کا سنِ طباعت یہی درج ہے۔ باقی نمبر ۵، ۴، ۱ کے تحت مندرج کتب کے سنینِ طباعت (جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے) بالترتیب یہ ہیں: ۲۰۱۹ء، ۲۰۱۳ء، ۲۰۱۰ء۔

اگر کسی کتاب پر سنِ طباعت، اشاعت مذکور نہیں ہوتا تو، جیسا کہ معروف ہے، ریکارڈ کے لیے ''سنہ ندارد''، ''بدون تاریخ'' یا ''سنِ طباعت درج نہیں ہے''، لکھا جاتا ہے۔

''معارف'' کو موصول ہونے والی کتب میں سے تبصرہ کے لایق کتابوں کا انتخاب بلاشبہ مدیرِ محترم، مجلسِ ادارت کے دائرۂ اختیار میں ہے (جیسا کہ جنوری ۲۰۲۳ء کے شذرات کے آخر میں اس نکتہ پر خاص زور دیا گیا ہے)، اسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ احساس ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ ''معارف'' جیسے معیاری رسالہ کے سلسلہ میں کسی اصول یا ضابطہ سے (کسی بھی وجہ سے) سمجھوتہ کرنا قارئین کے مفاد سے سمجھوتہ کرنے کے مترادف ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اقرا کالونی، علی گڑھ

معارف: اس سہو کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ آیندہ کوشش ہوگی کہ تمام ضروری تفصیلات تبصروں اور موصولہ کتب میں درج ہوں (مدیر)

رسید کتب موصولہ

اسلام کے (٦٠) ساٹھ مہان سبق (ہندی): پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ترجمانی زریاب احمد فلاحی، کے. اے. نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز، اے. ایم. یو. علی گڑھ صفحات: ۲۲۴۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔

اللہ کا دوست: عزیز حسن صابری ایڈووکیٹ، بلوسم پبلی کیشنز، شاہ ولایت نخاسہ سہارنپور، (یو. پی) صفحات ۸۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۸۰ روپے۔

تذکرہ اولیائے سہارنپور: عزیز حسن صابری ایڈووکیٹ، بلوسم پبلی کیشنز، شاہ ولایت نخاسہ سہارنپور، (یو. پی) صفحات ۲۰۸۔ سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت: درج نہیں۔

تاریخ بیت العلوم (جلد اول): مولانا ابن الحسن قاسمی، اشرفی کتب خانہ، مرکزی خانقاہِ شاہ ابرار، پھولپور۔ اعظم گڑھ، صفحات ۴۰۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت: درج نہیں۔

ترجمانی رحمانی حصہ ۲ (ہندی): پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ترجمانی زریاب احمد فلاحی، کے. اے. نظامی، سینٹر فار قرآنک اسٹڈیزف، اے. ایم. یو. علی گڑھ۔ صفحات ۴۱۳۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ٦۰۰ روپے۔

زوالِ امت کا سبب فرقہ آرائی اور تعصب: مولانا ڈاکٹر عبدالمعید، ابن فہیم، موضع بڑسرا، محلہ خطہ صوفیا، ضلع غازی پور۔ صفحات ۴۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات: مولانا اقبال حیدر ندوی، آفتاب بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ۔ صفحات ۲۵٦۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۰۰ روپے۔

فرائد المجالس و فوائد الموانس: ڈاکٹر عبدالسلام محمد ادیب کیلانی، دار الصفوہ، ماشاء اللہ ہاؤس قاضی باغ۔ لکھنؤ۔ صفحات ۲۹۳۔ سال اشاعت ۲۰۱۴ء، قیمت: درج نہیں۔

منزل منزل سایہ (مجموعہ نعت): جناب ابوذر انصاری، نصیب منزل، محلہ دیوان شاہ کبیر، (تاڑتلہ) جونپور۔ صفحات ۱٦۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۸۰ روپے۔

مواعظ عشق و محبت (جلد دوم و سوم): مرتبین: مولانا ضیاء اللہ غازیپوری، محمد عاصم کمال الاعظمی، ولی اللہ رانچوی۔ خانقاہِ شاہِ ابرار افضل گڑھ، بجنور (یو. پی) صفحات (دوم ۵۲۵) و (سوم ۴۹۱)۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print **FEB 2023** Vol. 210/02

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	،، ،،	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	،، ،،	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	،، ،،	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	،، ،،	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	،، ،،	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-